معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسی روپے

پاکستان میں سالانہ دو سو روپے — فی شمارہ سات روپے

دیگر ممالک میں سالانہ — ہوائی ڈاک بیس پونڈ یا بتیس ڈالر

بحری ڈاک سات پونڈ یا گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ : حافظ محمد یحیٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس۔ ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

• سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH

• رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

• خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافہ کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

• معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
کمیشن ۲۵٪ ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۶۷ — ماہ ذی قعدہ ۱۴۲۱ھ مطابق ماہ فروری ۲۰۰۱ء — عدد ۲

فہرست مضامین

شذرات — ضیاء الدین اصلاحی — ۸۲-۸۴

مقالات

آسمان کیا ہے؛ بعض قرآنی حقائق تحقیقات جدیدہ کی روشنی میں — مولانا محمد شہاب الدین ندوی صاحب — ۸۵-۹۹

سیرۃ النبی جلد ہفتم کا مطالعہ — مولانا ڈاکٹر عبد اللہ عباس ندوی صاحب — ۱۰۰-۱۲۳

امیر خسرو بحیثیت فارسی رباعی نگار — جناب سید وحید اشرف کچھوچھوی صاحب — ۱۲۴-۱۳۸

مولانا اشرف علی تھانوی اور اصلاح معاشرت — ڈاکٹر سید ولی حسین جعفری صاحب — ۱۳۹-۱۵۲

معارف کی ڈاک

جناب امین مسعود صدیقی کی معروضات — جناب محمد امین صدیقی صاحب — ۱۵۳-۱۵۴

مطبوعات جدیدہ — ع۔ ص۔ — ۱۵۵-۱۶۰

شذرات

۲۶ جنوری کو جشنِ جمہوریت کے موقع پر گجرات میں قیامتِ صغریٰ آئی ہوئی تھی، ابھی اڑیسہ کے طوفان سے ملک نے سنبھالا نہیں لیا تھا کہ زلزلے نے گجرات کو تہس نہس کر ڈالا اور سورج کی شعاعوں کو گرفتار اور ستاروں پر کمندیں ڈالنے اور سیاروں کو مسخر کرنے والا عہد ترقی کا انسان مجبوری و بے بسی اور ضعف و ناتوانی کی تصویر بنا رہا اور اپنا کوئی تحفظ و دفاع نہیں کر سکا، خبریں پڑھ اور سن کر درد مند لوگ تڑپ اٹھے اور بے چین ہو گئے، گجرات میں ہونے والی ہلاکتوں اور بربادیوں نے پھر ان واقعات پر مہر تصدیق لگا دی جو اہل قریٰ اور اقوام گزشتہ کے قرآنِ مجید میں بیان ہوئے ہیں اور جن سے عبرت و تذکر حاصل کرنے کے بجائے مرفہ الحال لوگ اساطیر الاولین کہہ کر جھٹلاتے اور مذاق اڑاتے رہے ہیں۔

اور زبانوں کی طرح ہمارے ملک کی زبانوں میں بھی طوفانِ نوح ضرب المثل بن گیا ہے۔ قومِ عاد کی تباہی تیز و تند اور خشک ہوا سے ہوئی، یہ ہوا جس چیز پر سے گزرتی تھی اسے ریزہ ریزہ کر دیتی تھی۔ یہ بڑے منحوس ایام میں سات رات اور آٹھ دنوں تک اسی طرح چلتی اور ان کا استیصال کرتی اور انہیں اکھاڑ پھینکتی رہی کہ وہ اکھڑی کھجوروں کے تنے کے مانند معلوم ہوتے تھے اور ان کے گھروں کے آثار کے سوا کسی چیز کا نام و نشان نظر نہ آتا تھا۔ قومِ ثمود کی تباہی رجفہ (کپکپی، تھرتھراہٹ) صیحہ، (ڈانٹ) صاعقہ (کڑک)، طاغیہ (حد سے بڑھی ہوا) سے ہوئی۔ یعنی ان پر سرما کی بادِ صرصر، کڑک دھمک اور زلزلے کا عذاب آیا اور ان کی یہ کیفیت ہوئی کہ وہ اپنے گھروں میں اوندھے منھ پڑے رہ گئے، اور پھر نہ اٹھ سکے اور نہ اپنا بچاؤ کر سکے اور اس طرح بے نام و نشان ہوئے گویا وہ ان گھروں میں بسے ہی نہیں تھے یا باڑھ لگانے والے کے باڑھ کی طرح گھروں کے آثار ہی باقی رہے۔ حضرت شعیبؑ کی قوم بھی رجفہ (کپکپی) اور صیحہ (ڈانٹ) سے ہلاک ہوئی، جس کے بعد وہ اپنے گھروں میں پڑے کے پڑے رہ گئے، گویا وہ کبھی ان میں آباد ہی نہیں ہوئے تھے۔

بعض اور اقوام کی بستیوں کی ویرانی کا بھی یہی حال ہوا۔ سورۂ قصص میں ہے "کتنی اکڑنے اور ناز کرنے والی بستیوں کا سامانِ معیشت ہم نے تباہ کر دیا پھر ان کے ویران گھر بہت کم آباد ہو سکے"۔

قومِ لوط کی بستی تہ و بالا کر دی گئی اور ان پر تہ بہ تہ نشان زدہ سنگِ گل کی بارش کی گئی، قومِ سبا داستانِ پارینہ اور تتر بتر ہو گئی، فرعون اور اس کا لاؤ لشکر سمندر میں پھینک دیا گیا قارون اور اس کا گھر زمین میں دھنسا دیا گیا، نہ کوئی اس کا یار و مددگار ہوا اور نہ وہ خود اپنا تحفظ کر سکا، سورۂ عنکبوت میں ہلاکت کی اکثر صورتیں یکجا کر دی گئی ہیں۔ فرمایا "ہر ایک کو ہم نے اس کے جرم کی وجہ سے آ دبوچا، بعض پر ہم نے کنکر پتھر برسانے والی طوفانی ہوا (حاصب) بھیجی، بعض کو کڑک (رعد و برق) نے آ پکڑا، بعض کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور بعض کو غرق کر دیا۔

قرآنِ مجید نے ان قوموں کے واقعات تاریخی دلائل کے طور پر انذار و تخویف اور اعتبار و انتباہ کے لئے بیان کئے ہیں۔ یہ سب بڑے رعب و دبدبہ اور شان و شوکت کی مالک تھیں جنھیں اللہ نے زمین میں اقتدار و تمکن بخشا تھا، مگر ان کا انجام نہایت بدتر ہوا، کیونکہ یہ دنیا اندھیر نگری نہیں ہے، بلکہ اس کا خالق و مالک اسے نظامِ عدل و قسط کے مطابق چلا رہا ہے، اس میں ایک پتہ بھی اس کے حکم و مشیت کے بغیر نہیں ہلتا، کائنات کے ہر گوشے میں اس نے میزان رکھی ہے جس سے کوئی چیز سر مو تجاوز نہیں کرتی، انسان کے لئے بھی میزان بنائی گئی ہے اور وہ خدا کے مقرر کردہ قوانین کا پابند بنایا گیا ہے۔ اگر وہ ان سے انحراف اور خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کی ناقدری کرے گا تو اللہ زیادہ دنوں تک نظامِ حق و عدل میں خلل، زمین میں شر و فساد، ظلم و جور اور زیادتی و ناانصافی کو برداشت نہیں کرے گا۔ یہ بات مسلمانوں کو خاص طور پر سمجھ لینی چاہئے کہ وہ دنیا میں خدا کا پیغام پہنچاتے اور نظامِ عدل و قسط قائم کرنے کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ یہ آفات و بلایا عبرت و تنبیہ کے لئے ہوتی ہیں۔ وہ مصیبت زدہ لوگوں کی دل کھول کر مدد کریں۔ خوشی ہے کہ وہ راحت رسانی کے کاموں میں نام نمود

اور صلہ وستائش کی تمنا کے بغیر پیش پیش ہیں۔

اُدھر گجرات میں تباہی آئی ہوئی تھی اور یہاں الہ آباد کے مہا کمبھ میلے اور دھرم سنسد کے جلسے میں وشو ہندو پریشد اور جارحیت پسند جماعتیں مسلمانوں کے خلاف زہر افشانی اور ان کے خدا و رسول کی شان میں بدتمیزی کر رہی تھیں ان کے ناشائستہ لب ولہجہ، خراب زبان اور فول اور بیہودہ باتوں سے شریف ہندوؤں کو بھی گھن آگئی۔ مگر ریاستی اور مرکزی حکومتوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی اور اس اشتعال انگیزی کے خلاف کارروائی تو درکنار لب کشائی کی بھی انہیں ہمت نہیں ہوئی۔ مسلمانوں کے لئے جارحیت اور بدتمیزی کا جواب دینا روا نہیں، لیکن ان کا عقیدہ ہے کہ خدائے علیم وخبیر سب کچھ سن اور دیکھ رہا ہے ؎

تاریخِ امم کا یہ پیام ازلی ہے — صاحب نظراں نشۂ قوت ہے خطرناک

'نعتِ نبوی میں ہندوستان کی عربی شاعری کا حصہ' کے زیرِ عنوان ۲۳، ۲۴ جنوری کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے زیرِ اہتمام ایک سمینار ہوا جس کے افتتاحی جلسہ کی صدارت وائس چانسلر حامد انصاری صاحب نے کی، پھر دو روز تک مقالات کے جلسے مختلف اہل علم کی صدارت میں ہوئے۔ جس میں دہلی کی مختلف یونیورسٹیوں کے علاوہ ڈاکٹر فضل کبریا پٹنہ، ڈاکٹر رفیع الدین ناگ پور، مولانا حبیب ریحان خاں تاج المساجد بھوپال اور دارالمصنفین سے راقم نے شرکت کی، شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی کے دو استاذوں ڈاکٹر مسعود انور علوی اور ڈاکٹر ابو سفیان اصلاحی نے مقالے پڑھے۔ راقم نے پروفیسر ریاض الرحمن خاں شروانی کی صدارت میں مولانا فیض الحسن سہارنپوری کی نعت گوئی پر مقالہ پیش کیا سمینار کی کامیابی اور وائس چانسلر صاحب کے بقول شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی کے عربی کو جیتی جاگتی زبان بنائے رکھنے کے لئے پروفیسر عبدالباری صدر شعبہ اور ڈاکٹر کفیل احمد قاسمی ڈائرکٹر سمینار مبارک باد کے مستحق ہیں۔

مقالات

آسمان کیا ہے؟

بعض قرآنی حقائق تحقیقات جدیدہ کی روشنی میں

از مولانا محمد شہاب الدین ندوی*

(۲)

ایک اشکال اور اس کا جواب

اوپر راقم السطور نے سمائے دنیا یا آسمان اول کی جو تفسیر و توجیہ کی ہے اس پر بعض آیات کی رو سے ایک اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ ساتوں آسمان مشہود اور اوپر تلے (ایک کے اوپر ایک) موجود ہیں، جیسا کہ سورۂ نوح کی آیت سے بظاہر ایسا ہی معلوم ہوتا ہے:

اَلَمْ تَرَوْا کَیْفَ خَلَقَ اللّٰہُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِیْھِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا (نوح: ۱۶-۱۷)

کیا تمہیں علم نہیں ہے کہ اللہ نے سات آسمان ایک کے اوپر ایک کس طرح پیدا کئے ہیں اور ان میں چاند کو روشن اور سورج کو چراغ بنا دیا ہے۔

یہاں پر لفظ "الم تروا" کا اطلاق دو معنوں پر ہو سکتا ہے: (۱) اگر اس کے معنی مشاہدہ کے لئے جائیں تو اس صورت میں اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ساتوں آسمان جو "اوپر تلے ہیں" وہ انسانوں کے مشاہدے میں ہیں۔ (۲) اور اگر اس کے معنی "علم" کے لئے جائیں تو اس صورت میں ان کا مشاہدہ میں آنا ضروری نہیں ہے۔ چنانچہ اوپر راقم سطور نے سات آسمانوں کی جو تاویل کی ہے وہ اس نقطۂ نظر سے صحیح ہو جائے گی۔

---

* جنرل سکریٹری فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ، بنگلور-۲۹۔

اس موقع پر ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ سات آسمانوں کے لئے ایک ہی سورج اور ایک ہی چاند کا تذکرہ کیوں کیا گیا ہے؟ حالانکہ خود ہمارے آسمان (آسمان اول) میں بے شمار کہکشائیں اور بے شمار سورج موجود ہیں اور اسی حساب سے بے شمار چاند بھی موجود ہوں گے۔ تو اس کا جواب دو طرح سے ہے، ایک یہ کہ ہماری آنکھوں کو چونکہ (بغیر دوربین کے) ایک ہی چاند اور ایک ہی سورج نظر آتا ہے اس لئے ایسا کہا گیا دوسرے یہ کہ اہل زمین کے لئے چونکہ ہمارے چاند اور سورج کی اہمیت زیادہ ہے اس لئے ایسا کہا گیا۔ چنانچہ ایک دوسری آیت میں بجائے سات آسمانوں کے صرف ایک آسمان کا تذکرہ کرنے کے بعد متعدد کہکشاؤں کی موجودگی کی خبر دی گئی ہے۔ پھر ان میں ہماری زمین والوں کی اہمیت کے نقطہ نظر سے ایک سورج اور ایک چاند کا ذکر آیا ہے:

تَبَارَكَ الَّذِي جَعَلَ فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَجَعَلَ فِيهَا سِرَاجًا وَقَمَرًا مُنِيرًا (فرقان: ۶۱)

بڑا ہی بابرکت ہے وہ جس نے آسمان میں (بہت سے) بروج (ستاروں کے جھرمٹ) بنا دئے اور اس میں ایک چراغ (سورج) اور ایک چاند بنا دیا۔

ظاہر ہے کہ پورے آسمان اور اس میں موجود تمام بروج (کہکشاؤں) میں صرف ایک ہی سورج اور ایک ہی چاند ہونا خلاف واقعہ بات ہے۔ اس موقع پر یہ حقیقت بھی واضح رہے کہ دور قدیم میں یونانیوں کا آسمانوں کے بارے میں جو نظریہ تھا وہ حد درجہ مضحکہ خیز تھا۔ چنانچہ وہ ایسے سات "افلاک" کے قائل تھے جو پیاز کے چھلکوں کی طرح ایک کے اوپر ایک باہم ملے ہوئے تھے اور دن رات میں ایک چکر پورا کر لیا کرتے تھے اور چاند سورج اور دیگر سیارے ان افلاک میں جڑے ہوئے خود بھی دن رات میں ایک چکر لگایا کرتے تھے۔

نو آسمانوں کا غلط نظریہ

موجودہ علم، تحقیق اور رویت و مشاہدہ کے دور میں اس قسم کے قدیم

نظریات جو محض ظن و تخمین کا نتیجہ تھے خرافات معلوم ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر سات آسمانوں کے وجود کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر:

ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ۔ (بقرہ: ۲۹)

پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا تو اسے (ٹھیک کرکے) سات آسمان بنا دئے۔

سات آسمانوں کے وجود پر یہ ایک "نص قطعی" ہے، جس کی تائید دیگر آیات سے بھی ہوتی ہے۔ قرآن حکیم کے بیانات میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ کیونکہ یہ خدائے علیم و خبیر کے علم ازلی پر مبنی کلام ہے، جس میں خلاف واقعہ بات کا گزر نہیں ہو سکتا۔ مگر دور قدیم میں یونانی نظریات سے متاثر ہو کر بعض مفسرین نے سات آسمانوں کے وجود میں شک کرتے ہوئے یونانی نظریات سے مطابقت پیدا کرنے کی غرض سے کہہ دیا کہ قرآن میں سات آسمانوں کے تذکرے سے ان سے زیادہ ہونے کی نفی نہیں ہوتی۔ کیونکہ فلسفہ یونان میں نو آسمانوں (افلاک) کا وجود تسلیم کیا گیا ہے۔ چنانچہ رازی جیسے نقاد فلسفہ نے اس سلسلے میں تذبذب کا اظہار اس طرح کر دیا ہے:

فان قال قائل فهل يدل التنصيص على سبع سماوات على نفي العدد الزائد، قلنا الحق ان تنصيص العدد بالذكر لا يدل على نفي الزائد [1]

یعنی اگر کوئی یہ کہے کہ کیا سات آسمانوں کا بیان عدد زائد کی نفی کرتا ہے؟ تو ہم کہیں گے کہ اس عدد (سات) کا تذکرہ زائد کی نفی نہیں کرتا۔

واضح رہے یونانی نظریات کے مطابق ہمارے نظام شمسی کے بعض سیاروں کو مع آفتاب کے سات آسمان (افلاک) قرار دے دیا گیا تھا، جس کی تفصیل اس طرح ہے: (۱) چاند (۲) عطارد (۳) زہرہ (۴) آفتاب (۵) مریخ (۶) مشتری (۷) اور زحل۔ ان سات افلاک کے علاوہ مزید دو

افلاک کا وجود بھی مانا گیا تھا۔ چنانچہ آٹھویں فلک کو "فلک البروج" اور نویں کو فلک الافلاک کہا گیا ہے اور یونانیوں کا نظریہ یہ تھا کہ تمام ستارے آٹھویں فلک میں جڑے ہوئے ہیں اور افلاک چونکہ شیشے کی طرح شفاف ہیں اس لئے وہ سب ہم کو پہلے فلک میں جڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور نواں فلک تمام افلاک و اجسام کو محیط ہے اور اس کے ماوراء کوئی چیز موجود نہیں ہے۔[۴]

بغیر علم و تحقیق کے ان ادعائی بیانات سے متاثر ہو کر امام رازی کے بعد بعض دیگر مفسرین نے بھی یونانی نظریات سے مطابقت پیدا کرنے کی غرض سے سات آسمانوں کے وجود میں شک و شبہ کا اظہار کرتے ہوئے عرش اور کرسی کو آٹھواں اور نواں آسمان قرار دے دیا۔ جیسا کہ اس سلسلے میں قاضی بیضاوی اور شہاب الدین آلوسی بغدادی کی روش سے ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ اول الذکر تحریر کرتے ہیں:

فان قیل: الیس ان اصحاب الارصاد اثبتوا تسعۃ افلاک؟ قلت فیما ذکروہ شکوک وان صح فلیس فی الآیۃ نفی الزائد مع انہ ان ضم الیہا العرش والکرسی لم یبق خلاف۔[۴]

یعنی اگر یہ کہا جائے کہ کیا فلکیات دانوں نے نو افلاک کا اثبات نہیں کیا ہے؟ تو میں کہوں گا کہ انہوں نے جو کچھ بیان کیا ہے اس میں کافی شبہات ہیں، لیکن اگر یہ بات صحیح بھی ہو تو اس آیت میں زائد کی نفی نہیں ہے، کیونکہ اگر ان افلاک کے ساتھ عرش اور کرسی کو بھی ملا لیا جائے تو کسی قسم کا اختلاف باقی نہیں رہے گا۔

اور ثانی الذکر نے امام رازی اور قاضی بیضاوی کے بیانات کو بنیاد بنا کر انہیں دونوں کے اقوال کو دہرایا ہے جیسا کہ وہ تحریر کرتے ہیں: فلیس فی الآیۃ ما یدل علی نفی الزائد بناء علی ما اختارہ الامام من ان مفہوم العدد لیس بحجۃ، وکلام البیضاوی فی تفسیرہ یشیر الیہ۔[۵]

فلسفہ یونان کا ابطال

حالانکہ ان نظریات و مفروضات پر کوئی عقلی یا شرعی دلیل موجود نہیں ہے بلکہ یہ محض ادعائی بیانات و مزعومات تھے، جن کو جدید سائنس نے بالکل باطل قرار دے دیا ہے اور دوسری طرف جدید سے جدید تر تحقیقات و اکتشافات کے باعث قرآن حکیم کے مبہم بیانات کی تصدیق و تائید پے در پے سامنے آرہی ہے۔ تفصیل کے لئے ایک دفتر چاہئے مگر اس موقع پر بطور اختصار عرض ہے کہ:

(۱) جدید فلکیات کی رو سے ثابت ہو چکا ہے کہ یونانی نظریات کے مطابق ہماری کائنات سات سیاروں اور "نو افلاک" میں محدود نہیں بلکہ اربوں کہکشاؤں (ستاروں کے مجموعے) اور کھربوں ستاروں (ہمارے سورج جیسے) کا مجموعہ ہے اور یہ سب اجرام وسیع اور بے کراں خلاؤں میں تیرتے پھر رہے ہیں اور یہ پوری کائنات اس قدر وسیع ہے کہ اس میں ہمارے نظام شمسی کی حیثیت کسی بہت بڑے ریگستان میں ایک ریت کے ذرہ جیسی ہے۔

(۲) تمام ستارے اور سیارے کسی فلک میں جڑے ہوئے نہیں بلکہ بے کراں خلاؤں میں بغیر کسی سہارے کے تیرتے پھر رہے ہیں۔ (كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ) اور ان میں ہمارا سورج بھی شامل ہے۔

(۳) یونانیوں کا نظریہ تھا کہ افلاک یا اجرام سماوی کا مادہ ہماری زمین کے مادے سے مختلف ہے جو غلط ثابت ہو چکا ہے۔

(۴) یونانیوں کا نظریہ تھا کہ افلاک (اجرام سماوی) میں "خرق والتیام" محال ہے۔ یعنی ان کا مادہ نہ تو ٹوٹ سکتا ہے اور نہ ٹوٹنے کے بعد پھر دوبارہ جڑ سکتا ہے۔ چنانچہ پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے کہ قرآن اور سائنس دونوں اجرام سماوی کی ٹوٹ پھوٹ اور ان کے بکھراؤ پر متفق اللفظ ہیں۔ ہمارے سورج جیسے ستاروں میں ہائیڈروجن گیس پائی جاتی ہے جو مسلسل جل جل کر ہیلیم (ایک دوسرے عنصر) میں تبدیل ہوتی جارہی ہے چنانچہ ستاروں میں روشنی، چمک اور حرارت کی وجہ اسی کے جلنے کی بدولت ہے اور ستارے بعض نامعلوم وجوہات کی بنا پر دھماکوں سے پھٹتے رہتے ہیں اور اس قسم کے پھٹنے والے ستاروں کو "حادث ستارے" کہا جاتا ہے۔

(۵) یونانی فلکیات کے مطابق ساتوں افلاک تہ بہ تہ پیاز کے چھلکوں کی طرح ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ جب کہ حدیث شریف میں تصریح موجود ہے کہ ہر دو آسمانوں کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت پائی جاتی ہے، جس طرح کہ ہماری زمین اور آسمان کے درمیان کا فاصلہ ہے:

ما بین کل السمائین کما بین السماء والارض [7]

(۶) یونانیوں کا عقیدہ یہ بھی تھا کہ اجرام سماوی متحرک بالارادہ ہیں اور ان میں عقل و شعور بھی پایا جاتا ہے اور یہ بات جدید تحقیقات و نظریات کی رو سے بالکل غلط اور مہمل ہے۔ بلکہ موجودہ نظریات کی رو سے تمام اجرام سماوی باہمی جذب و کشش (گریوٹیشن) کی بدولت فضاؤں اور خلاؤں میں تیر رہے ہیں۔

كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ — ہر ایک اپنے مدار میں تیر رہا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يُمْسِكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ أَن تَزُولَا (فاطر: ۴۱) — اللہ آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے کہ وہ اپنی جگہ سے ہٹنے نہ پائیں۔

(۷) یونانی نظریات کی رو سے فلکیات اپنے پورے مواد اور شکل و صورت کے ساتھ "قدیم" ہیں۔ یعنی وہ مخلوق نہیں بلکہ ہمیشہ سے ہیں:

وذھب ارسطو ومن تبعہ کالفارابی وابن سینا الی انھا قدیمۃ بذواتھا وصفاتھا، وقالوا..... (اما الفلکیات فانھا قدیمۃ بموادھا وصورتھا الجسمیۃ والنوعیۃ) [8]

(۸) جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا یونانی نظریات سے مرعوب ہو کر بعض مفسرین نے کرسی اور عرش کو آٹھواں اور نواں فلک قرار دے دینے کی جرأت کر دی۔ مگر انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ یہ افلاک جو آنکھوں کو نظر نہیں آتے۔ بلکہ انہیں محض ادعائی طور پر فرض کر لیا گیا ہے، وہ کرسی اور عرش کس طرح ہو سکتے ہیں؟ کیونکہ حدیث نبوی کی تصریح کے مطابق ساتوں آسمان کرسی کے مقابلے میں ایک ردی سی چیز کی طرح اور اسی طرح ساتوں آسمان کرسی سمیت عرش کے مقابلے میں ایک ذرہ کے مانند ہیں۔ پھر کیا باری تعالیٰ جو عرش پر

مستوی ہے وہ بھی معاذ اللہ عرش سمیت ان افلاک کے ساتھ گھوم رہا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ ایک مضحکہ خیز صورت حال ہے جو بالکل مہمل اور لایعنی ہے۔

آسمان اول کی بعض تفصیلات

غرض مذکورہ بالا احادیث سے دو حقیقتیں ثابت ہوتی ہیں: (۱) ہر دو آسمانوں کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت کا فاصلہ موجود ہے: ما بینھما مسیرۃ خمس مائۃ سنۃ۔

مگر پانچ سو سال کی مسافت کس قسم کی رفتار سے ہوگی؟ اس کی صراحت نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر بے انتہا دوری ظاہر کرنا مقصود ہے نہ کہ متعین طور پر پانچ سو سال کا فاصلہ قرار دینا۔ (چنانچہ اس سلسلے میں دوسری جو حقیقت مذکور ہے وہ اس بے انتہا فاصلے کے تعین کے سلسلے میں مزید وضاحت ہے۔ یعنی ہر دو آسمانوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا کہ ہماری زمین اور آسمان کے درمیان پایا جاتا ہے: ما بین کل سمائین کما بین السماء والارض۔

اب سوال یہ ہے کہ ہماری زمین کا آسمان کہاں ہے؟ تو اس سلسلے میں قرآن حکیم میں جو اشارات مذکور ہیں ان کی رو سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ دوربینوں سے نظر آنے والی کہکشاؤں سے پرے واقع ہو سکتا ہے۔ کیونکہ قرآن حکیم کی صراحت کی رو سے جتنے بھی ستارے (نجوم و کواکب) اور کہکشائیں (بروج) ہم کو نظر آتے ہیں (خواہ وہ خالی آنکھ سے ہوں یا دوربینوں کے ذریعہ) وہ سب کے سب آسمان اول یا سمائے دنیا میں داخل ہیں جیسا کہ ارشاد باری ہے:

وَزَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَحِفْظًا (حم سجدہ: ۱۲) — ہم نے قریبی آسمان کو چراغوں سے آراستہ کیا ہے (اور اسے ہر طرح سے) محفوظ کر دیا ہے۔

اس موقع پر آسمان اول کو "محفوظ کر دینے" سے مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھی نہ اس پار جا سکتا ہے اور نہ ہی اس پار جھانک کر دیکھ سکتا ہے۔ کیونکہ اس کی سرحد ایک ٹھوس چیز سے بند کر دی گئی ہے۔

وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا وَهُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ۔ (انبیاء: ۳۲)

اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنا دیا ہے اور یہ لوگ اس کی نشانیوں سے روگردانی کر رہے ہیں۔

نیز اس سلسلے میں مزید وضاحت اس طرح آئی ہے:

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ (ملک: ۵)

اور ہم نے قریبی آسمان کو چراغوں سے مزین کر دیا ہے۔

اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ِۨالْكَوَاكِبِ (صافات: ۶)

ہم نے قریبی آسمان کو ستاروں کی زینت سے آراستہ کر دیا ہے۔

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ (حجر: ۱۶)

اور ہم نے آسمان (اول) میں بہت سے برج (ستاروں کے مجموعے) بنا دیے ہیں اور انہیں غور سے دیکھنے والوں کے لئے آراستہ کر دیا ہے۔

دیکھئے ان تمام آیات میں "سماء" واحد آیا ہے اور متعدد آیات میں اس کی صفت "الدنیا" آئی ہے یعنی قریبی یا پہلا آسمان۔ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ ہماری آنکھوں کو نظر آنے والے اجرام یا مشہود کائنات آسمان اول میں واقع ہے اور بقیہ چھ آسمان ہماری آنکھوں سے اوجھل ہیں۔ ہر دو آسمانوں کے درمیان ایک ٹھوس چیز بطور پردہ موجود ہے جسے قرآن حکیم میں "سقف محفوظ" یعنی ایک مضبوط چھت کہا گیا ہے۔ چنانچہ معراج نبوی کے سلسلے میں وارد حدیثوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر آسمان میں دروازے موجود ہیں جن پر دربان متعین ہیں جو بغیر اجازت کسی کو اس پار جانے نہیں دیتے۔ غرض ہماری مشہود کائنات ہی کے آسمان اول ہونے کا ایک اور ثبوت حسب ذیل آیت کریمہ بھی ہے، جس کے مطابق قیامت کے موقع پر ستاروں اور کہکشاؤں سے معمور اس کائنات کی بساط لپیٹ دی جائے گی۔

يَوْمَ نَطْوِى السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ۭ كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ۭ وَعْدًا عَلَيْنَا ۭ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ (انبیاء: ۱۰۴)

جس دن ہم آسمان کو اس طرح لپیٹ دیں گے جس طرح کہ لکھے ہوئے اوراق کا پلندہ لپیٹا جاتا ہے۔ جس طرح ہم نے تخلیق اول کی ابتدا کی تھی اسی طرح ہم اسے لوٹائیں گے۔ یہ ہمارے ذمہ ایک وعدہ ہے اور ہم اسے پورا کرکے رہیں گے۔

اس اعتبار سے حسب ذیل آیات میں آسمان کے پھٹنے سے مراد پوری آسمانی دنیا کا انتشار یا تخریب کائنات مراد ہے:

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ (انفطار: ۱-۲)

جب آسمان پھٹ جائے گا اور جب ستارے بکھر جائیں گے۔

چنانچہ ان آیات کے مطابق آسمان کے پھٹنے کی کیفیت یہ ہوگی کہ تمام ستارے منتشر و پراگندہ ہو جائیں گے جو اختتام کائنات کا اعلان ہے۔

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ (انشقاق: ۱)

جب آسمان شق ہو جائے گا۔

فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ (رحمان: ۳۷)

جب آسمان پھٹ جائے گا تو وہ گلابی تیل کی طرح سرخ ہو جائے گا۔

وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ (حاقہ: ۱۶)

اور آسمان پھٹ جائے گا تو وہ اس دن (انتہائی) بودا ہوگا۔

وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ (تکویر: ۱۱)

جب آسمان کا پوست اتارا جائے گا۔

السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ ۭ كَانَ وَعْدُهٗ

اس دن آسمان پھٹ جائے گا، اس کا وعدہ

مَفْعُوْلًا (مزمل : ۱۸) — پورا ہو کر رہے گا۔

یہ اور اس قسم کی دیگر تمام آیات ایک ہی حقیقت عظمیٰ کی ترجمانی کر رہی ہیں اور اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کر رہی ہیں کہ قیامت کے موقع پر آسمانی دنیا کی کیفیت کیا ہوگی۔ غرض جب زمین و آسمان پوری طرح تباہ و برباد کر دئے جائیں گے تو پھر انہیں دوبارہ نئے سرے سے وجود میں لایا جائے گا، جیسا کہ ارشاد باری ہے:

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (ابراہیم: ۴۸)	جس دن کہ یہ زمین بدل کر دوسری زمین لائی جائے گی اور اسی طرح آسمان بھی بدل دئے جائیں گے، اور یہ سب کے سب اللہ کے روبرو حاضر ہو جائیں گے جو واحد اور زبردست ہستی ہے۔

ایک وضاحت

اوپر مذکورہ تفصیلات کی رو سے بدلائل معلوم ہو گیا کہ آسمان اول کا یہ مفہوم نہ لیا جائے تو پھر اشکال پیدا ہوتا ہے کہ ہم بقیہ چھ آسمان کس کو قرار دیں؟ کیونکہ ایک تو دوربینوں سے نظر آنے والی کہکشاؤں کو "آسمان" قرار دینا ممکن نہیں ہے اور پھر ان پر "سات" کا اطلاق کرنا ایک امر محال ہے۔ بلکہ اس صورت میں تو آسمانوں کی تعداد اربوں تک پہنچ جائے گی، سات میں محدود نہ رہے گی۔ مزید یہ کہ اس صورت میں "سقف محفوظ" کا نظریہ بھی مہمل بن جائے گا۔ یعنی اس کا کوئی مفہوم نہ رہے گا۔

لہٰذا ان تمام اعتبارات سے ماننا پڑے گا کہ بقیہ چھ آسمان ہماری آنکھوں سے مستور ہیں۔ مگر وہ کس قسم کے ہیں؟ آیا ان میں بھی ہماری کائنات کے مطابق چاند، ستارے اور کہکشائیں موجود ہیں یا نہیں؟ اس بارے میں ہمیں کوئی علم نہیں ہے۔ ان سب کا تفصیلی علم صرف خدائے علیم وخبیر ہی کو ہو سکتا ہے۔

اسلامی دور میں قانون تجاذب کا مفہوم

غرض تخریب کائنات کی یہ داستان بڑی عبرتناک ہے

جو جدید ترین نظریات و انکشافات کی روشنی میں ایک حقیقت نظر آرہی ہے۔ قرآنی بیانات اور اس کے دعووں کو سمجھنا موجودہ نظریات کی روشنی میں بہت آسان ہو گیا ہے، ورنہ دور قدیم میں ان کا مفہوم واضح نہیں تھا۔ چنانچہ مختلف ستاروں، سیاروں اور دیگر اجرام سماوی کے درمیان جو "توازن" قائم ہے جس کی بنا پر وہ ایک دوسرے سے ٹکراتے نہیں بلکہ ہر ایک اپنے مدار میں تیرتے ہوئے محو گردش ہے، اس کی وجہ ان کے درمیان پایا جانے والا "عالمگیری قانون تجاذب" ہے، یعنی یونیورسل لا آف گراویٹیشن۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام اجرام سماوی ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔ کیونکہ ہر مادی شے میں دوسری مادی شے کو کھینچنے کی قوت یا تجاذب ہوتا ہے اور اس قوت کشش کی بنا پر ان سب کا باہمی توازن برقرار رہتا ہے اور وہ ایک دوسرے کو تھامے ہوئے گردش کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اگر ان کی یہ باہمی قوت جذب وکشش ختم کر دی جائے تو وہ آپس میں ٹکرا کر ختم ہو جائیں گے۔ مثال کے طور پر اگر آپ ایک گیند کو ڈوری میں باندھ کر اسے گھماتے رہیں گے تو آپ کے ہاتھ کی ڈوری بندھی ہوئی رہے گی اور وہ گھومتا رہے گا۔ لیکن اگر ڈوری ٹوٹ جائے تو وہ آپ کے ہاتھ سے نکل بھاگے گا اور اپنے مقابل سے ٹکرا جائے گا۔

دور قدیم میں قانون تجاذب کا یہ مفہوم واضح نہیں تھا، مگر پھر بھی اسلامی نظریات میں ہو بہو یہی مفہوم پایا گیا ہے۔ چنانچہ تفسیر کبیر میں سورۂ تکویر کی تفسیر میں کلبی سے منقول ہے کہ اس دن (قیامت کے موقع پر) آسمان ستاروں کی برسات کرے گا اور ہر ستارہ سطح ارض سے ٹکرا جائے گا۔ نیز عطاء سے منقول ہے کہ یہ بات اس طرح ہے کہ ستارے زمین اور آسمان کے درمیان معلق قندیلیں ہیں جو نور کے سلسلوں (یا ڈوریوں) میں (بندھی ہوئی) ہیں اور یہ ڈوریاں ملائکہ کے ہاتھوں میں ہیں۔ لیکن جب زمین اور آسمان کے تمام لوگ مرجائیں گے تو یہ ڈوریاں ملائکہ کے ہاتھوں سے چھوٹ جائیں گی۔[۹]

ان حقائق کے ملاحظہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی دور میں لوگ فلسفہ یونان کے مقلد جامد نہیں تھے۔ بلکہ یہ اور اس قسم کے نظریات یا تو منقولی ہیں جو عہد رسالت سے متوارث چلے آرہے تھے (اور خاص کر

حضرت ابن عباسؓ سے اس قسم کے بے شمار حقایق منقول ہیں) یا پھر عہد اسلامی میں مسلم سائنس دانوں کی تحقیق و تدوین کا نتیجہ ہیں

دور صحابہ میں کہکشاں کا تصور

ہمارے ذخیرۂ تفسیر پر ایک نظر ڈالنے سے اس قسم کے بہت سے حقایق سامنے آتے ہیں جو تحقیقات جدیدہ کے عین مطابق ہیں۔ ان حقایق کے ملاحظے سے حیرت ہوتی ہے کہ قدیم دور میں اہل اسلام اور خاص کر صحابہ کرام اور تابعین و تبع تابعین (رضوان اللہ علیہم اجمعین) جدید تحقیقات و اکتشافات سے بے خبر کائنات کے رموز و اسرار سے کس قدر آشنا تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے اس علم و اطلاع کی بنیاد تجرباتی نہیں بلکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنی ہوئی باتوں کی بنا پر ہی تھی جو خاص خاص صحابہ سے منقول ہے۔ چنانچہ دور صحابہ میں آسمان اور کہکشاں کا صحیح تصور حضرت علیؓ سے سورۂ انشقاق کی تفسیر میں اس طرح منقول ہے کہ آسمان مجرہ یعنی کہکشاں سے پھٹے گا:

وعن علی علیہ السلام انھا تنشق من المجرۃ [9]

یعنی آسمان کے پھٹنے کی ابتدا ہماری کہکشاں (ملکی وے یا دودھیائی راستے) سے ہوگی، جو زمین والوں کے لئے سب سے قریبی کہکشاں ہے اور اس میں ایک موٹے اندازے کے مطابق تقریباً ایک کھرب ستارے (ہمارے سورج جیسے) موجود ہیں۔

THE MILKY WAY IS OUR OWN GALAXY AND THE SUN IS ONLY ONE STAR OF THE 100 BILLION STARS IN IT. [10]

چنانچہ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ کہکشاں آسمان کا دروازہ ہے (المجرۃ باب السماء) اور اس سے مراد وہ دودھیائی راستہ ہے جو رات کے وقت آسمان میں ایک سفید لکیر کی شکل میں نظر آتا ہے۔ چنانچہ اس کی وضاحت خود حضرت ابن عباسؓ نے اس طرح کی ہے: (وھی البیاض المعترض فی السماء) [11]

تخریب عالم کی ابتدا تخریب سما سے کیوں؟

قرآن عظیم ایک انتہائی حکیمانہ کلام ہے جو علم و حکمت کے نکات سے بھرپور ہے۔ اس میں سائنٹفک نقطۂ نظر سے غور کرنے والوں کے لئے قدم قدم پر حقایق و معارف کا ایک انبار نظر آتا ہے۔ کیونکہ یہ رب العالمین کا کلام ہے جس کی نظر سے اس کائنات کی کوئی چیز اور کوئی حقیقت پوشیدہ نہیں ہے۔ بلکہ اس نے پوری منصوبہ بندی کے ساتھ اس عالم رنگ و بو کی تخلیق کی ہے اور اس عالم طبیعی کے تمام واقعات اس کی منصوبہ بندی ہی کے تحت وقوع میں آرہے ہیں۔ اسی بنا پر قرآنی آیات میں بھی منطقی ترتیب ملحوظ رکھی گئی ہے۔ یعنی ہر دو آیات کے درمیان بہت گہرا عقلی ربط و تعلق ہوتا ہے۔ چنانچہ سورہ انفطار کی ابتدائی پانچ آیات ملاحظہ ہوں، جو اس طرح ہیں:

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ (انفطار: ۱-۵)	جب آسمان پھٹ جائے گا اور جب ستارے جھڑ پڑیں گے اور جب سمندر ابل پڑیں گے اور جب قبریں کھول دی جائیں گی۔ تب ہر شخص جان لے گا کہ اس نے آگے کیا بھیجا اور پیچھے کیا چھوڑا۔

چنانچہ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ تخریب عالم کی ابتدا آسمان کو اجاڑنے سے کیوں کی گئی ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ آسمان بمنزلہ چھت کے ہے اور زمین بمنزلہ عمارت کے ہے۔ لہذا اگر کوئی شخص گھر کو تباہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو پہلے چھت کو توڑتا ہے۔ تو کہا گیا (اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ) پھر آسمان کی تباہی سے ستاروں کا بکھراؤ لازم ہوجاتا ہے تو کہا گیا (وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ) پھر آسمان و ستاروں کی تخریب سے زمین پر جو کچھ موجود ہے اس کی تخریب بھی ضروری ہوجاتی ہے اس لئے فرمایا (وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ) پھر اللہ تعالیٰ اپنے آخری فیصلے میں زمین کو بھی جو ایک عمارت کی طرح ہے تباہ کردے گا تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا (وَاِذَا

اَلْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ) یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ زمین کی قلب ماہیت کر دی جائے گی۔[13]

پھر اس کے بعد دنیا کے تمام اگلے اور پچھلے انسانوں کو اپنی اپنی قبروں سے نکال باہر کر کے ان کا محاسبہ کیا جائے گا اور ہر شخص کو اس کے اچھے اور برے اعمال کی جزا و سزا دی جائے گی۔ نتیجہ یہ کہ کسی کو جنت ملے گی تو کسی کو دوزخ۔ اس دن ہر شخص کو اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ اس نے دنیا میں کیا کیا تھا اور روز جزا میں اسے کیا ملا؟ جو کچھ اس نے کیا تھا اسی کا بدلہ ملے گا۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا	جس نے ذرہ بھر بھی نیکی کی ہے وہ اسے
يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا	دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ بھر بھی برائی
يَّرَهٗ (زلزال: ۶-۷)	کی ہے وہ بھی اسے دیکھ لے گا۔

حرفِ آخر حاصل بحث یہ کہ اسلام ایک عالمی و عقلی مذہب ہے جو علم و حکمت سے بھرا ہوا ہے اور اس کی دعوت توہمات یا غیر عقلی عقائد و نظریات پر مبنی نہیں۔ بلکہ علمی اور سائنٹفک دلائل اور نظام کائنات کے حقائق پر مبنی ہے۔ چنانچہ جدید سے جدید تر اکتشافات سے اس کے عقائد و تعلیمات کی حقیقت کھل کر سامنے آرہی ہے جن کے ملاحظہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام ایک سچا اور برحق دین ہے، جو اسی ہستی کی جانب سے بھیجا ہوا ہے جس نے اس کائنات کی تخلیق کی ہے۔ ورنہ قرآن اور کائنات کے حقائق میں اس قدر زبردست مطابقت ہرگز نہ پائی جاتی۔ لہذا یہ پوری نوع انسانی کے لئے ایک لمحہ فکریہ ہے کہ وہ خدا کے اس سچے مذہب کو اپنا کر اپنی عاقبت درست کر لے اور آخرت کے عذاب سے محفوظ ہو جائے۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ	کہہ دو کہ اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے
الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنِ اهْتَدٰى	رب کی طرف سے حق بات آچکی ہے۔ لہذا
فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ	اب جو کوئی راہ راست پر آئے گا تو وہ اپنی ہی

ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَمَآ اَنَا	بھلائی کے لئے ہوگا اور جو گمراہ ہوگا تو اس کا
عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ (یونس: ۱۰۸)	وبال بھی اسی پر ہوگا اور میں تمہارا ذمہ دار
	نہیں ہوں۔

مراجع و حواشی

[1] تفسیر کبیر: ۲/۱۷۴ [2] دیکھئے شرح چغمینی: ص ۲۲، مطبوعہ رحیمیہ دیوبند [3] دیکھئے تصریح (شرح تشریح الافلاک) ص ۶، رحیمیہ دیوبند [4] تفسیر بیضاوی: ۱/ ۲۷۶، دار الفکر بیروت [5] تفسیر روح المعانی: علامہ آلوسی، ۱/ ۲۱۷، دار احیاء التراث العربی بیروت [6] دیکھئے فتاوی ابن تیمیہ: ۶/ ۵۴۶ [7] جامع ترمذی: کتاب تفسیر القرآن، ۵/ ۴۰۳، دار احیاء التراث العربی، بیروت۔ نیز ملاحظہ ہو مسند احمد: ۲/ ۳۷۰، المکتب الاسلامی بیروت، ۱۳۹۸ھ [8] کشاف اصطلاحات الفنون: ۱/ ۵۶۵، جدید ایڈیشن بیروت [9] تفسیر کبیر: ۳۱/ ۶۸، مطبوعہ دار الفکر بیروت [10] تفسیر کبیر: ۳۱/ ۱۰۳ [11] OXFORD ENCYCLOPEDIA, VOL. 8, P. 54. [12] النہایۃ فی غریب الحدیث: ۱/ ۲۲۹، لسان العرب: ۴/ ۱۲۹ [13] تفسیر کبیر: ۳۱/ ۷۸۔

سیرۃ النبیؐ جلد ہفتم کا مطالعہ

از

مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی ٭٭

حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی آخری یادگار سیرۃ النبیؐ جلد ہفتم کے چند ابتدائی ابواب کو مرحوم سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب نے یکجا کرکے شایع کردیا تھا۔ اس کے اب تک سات اڈیشن نکل چکے ہیں۔ دارالمصنفین سے آخری اڈیشن ۱۹۹۲ء میں شایع ہوا ہے اور سیرۃ النبی چھٹی جلد ۱۹۳۶ء میں پہلی مرتبہ شایع ہوئی تھی۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندویؒ نے حیات سلیمان میں اس جلد کے بارے میں جو لکھا ہے وہ اس مقالہ کے لیے تمہید و تعارف کا کام دے گا، اس کو ہم یہاں نقل کرتے ہیں

"نومبر ۱۹۳۶ء میں سیرت النبی کا چھٹا حصہ شایع ہوا، اس کا موضوع اسلام کی اخلاقی تعلیمات ہیں، اس میں پہلے اسلام میں اخلاق کی اہمیت بتائی گئی ہے اور اسلامی فلسفۂ اخلاق کی تشریح کی گئی ہے، پھر اسلام کی اخلاقی تعلیمات، فضائل و رذائل اخلاق اور اسلامی آداب و اخلاق کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ اخلاقی معلم کی حیثیت سے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ کتنا بلند ہے۔"

٭٭ معتمد تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

اہل علم نے اس حصہ کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی نے اس پر ایک مبسوط تبصرہ لکھا جو ۱۹۴۰ء کے معارف کے کئی نمبروں میں شایع ہوا۔ حضرت سید صاحب اس تبصرہ کے متعلق لکھتے ہیں:

"پچھلے پرچے سے سیرۃ النبی علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم کی چھٹی جلد پر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیمات پر مشتمل ہے، ایک ذمہ دار صاحب قلم کے قلم سے جو تبصرہ بصیرت افروز ہو رہا ہے، وہ خاکسار مولف کی پوری چوتھائی صدی کی خدمت کا ایک ایسا معاوضہ ہے جس کے لیے وہ سراپا سپاس گزار ہے، یہ تبصرہ بجائے خود اس تاریک زمانہ میں جس کو روشنی کا زمانہ کہا جاتا ہے، فکر و عمل کے لیے چراغ راہ ہے۔ ضرورت ہے کہ اہل نظر اس کو بار بار پڑھیں اور اس کی تہہ تک پہنچیں۔

خاکسار مولف کی بڑی خواہش تھی کہ علوم اسلامیہ اور اخبار محمدیہ کے ماہرین میں سے کوئی صاحب ہمدردی اور دلسوزی کے ساتھ غور فرماتے کہ مولف جس راستہ پر چل رہا ہے وہ کہاں تک صحیح ہے اور کہاں تک اس میں اصلاح کی گنجائش ہے۔ مولف کی دیرینہ خواہش کی یہ پہلی تکمیل ہے صاحب تبصرہ نے اپنی لطیف و نازک طرز تحریر میں مولف کو جن گوشوں کی طرف توجہ دلائی ہے وہ پہلے سے بھی نظر میں تھے اور اب وہ اور زیادہ انشاء اللہ قابل توجہ رہیں گے۔

زمانہ کے دست شاطر نے ہمارے علماء کے سامنے اب بالکل نئی بساط بچھائی ہے، نئے خیالات اور نئے مسائل کی نئی مشکلات ہمارے سامنے ہیں۔ ضرورت تو یہ تھی کہ اہل فکر اور عاقبت بیں علماء آپس میں مل کر ان مشکلات کا حل سوچتے اور ان کی راہیں کھولتے لیکن جب اس وقت یہ صورت نہیں تو شخصی طور سے جس سے جو کچھ ہو سکتا ہے اس کو کرتا ہے، سیرۃ نبویؐ کی جلدیں ان ہی حالات و خیالات کو سامنے رکھ کر ترتیب پا رہی ہیں۔ السعی منی والاتمام من اللہ تعالیٰ۔

چھٹی جلد کے بعد ساتویں جلد کا مرحلہ ہے اور سب کو معلوم ہے کہ اس جلد کا موضوع "معاملات"

ہوگا، معاملات سے مقصود اسلام کے وہ مسائل ہیں جن کی حیثیت قانون کی ہے، اس میں سب سے پہلی چیز خود سلطنت اور آداب سلطنت ہیں، پھر اسلام کے ہر قسم کے قوانین، معاشرتی، مدنی، اجتماعی، اقتصادی کی تشریح کا کام ہے، یہ ہمارے لئے مباحث کا نیا راستہ ہوگا اور اسی لئے اس کو طے کرنے کی مشکلیں بھی نظر کے سامنے ہیں"۔[1]

وہ مشکلات کیا تھیں اس کو بھی خود حضرت سید صاحب نے سیرۃ النبی ؐ کے مقدمہ میں تحریر فرمایا ہے:

"اول تو ضرورت یہ ہے کہ ان مسائل کی تشریح ایسے رنگ میں کی جائے جس سے مذاقِ حال تسکین پاسکے اور ان کے علاوہ جو مسائل آج ہمارے سامنے نئے ہیں ان کا حل بھی ان کے سابق نظائر کو سامنے رکھ کر سوچا جائے ان امور کی تشریح میں ہزار احتیاط کے باوجود قلم کے مسافر کو ایسی راہوں سے گزرنا ہوگا جن میں ہر قدم پر لغزش کا خطرہ ہے اور خصوصاً اس لئے کہ سیاسیات و اقتصادیات کے موجودہ متوقع سوالوں کے جوابات اور ان کے متعلقہ اصولی نظریات سے قدما کی کتابیں نصاً خالی ہیں اور ان کی روشنی کے بغیر راہ کو سلامتی سے طے کرلے جانا بہت ہی مشکل نظر آتا ہے"۔[2]

آگے بڑھ کر لکھتے ہیں:

"اس جلد کے لکھنے میں اس ہیچ مداں کو سالہا سال ہچکچاہٹ محسوس ہوتی رہی اور بارہا قلم کو آگے بڑھا بڑھا کر پیچھے ہٹا لینا پڑا۔ چنانچہ کام کا آغاز گو ۷؍ جمادی الثانی ۱۳۵۵ھ کو کر دیا گیا تھا، لیکن کچھ صفحے لکھ کر چھوڑ دئے، دو سال کے بعد ۲۹؍ رمضان ۱۳۶۱ھ کو پھر لکھنے کا تہیہ کیا اور پھر رک جانا پڑا۔ ۲۴ شعبان ۱۳۶۲ھ کو پھر قلم اپنے سفر پر چلنے کو آمادہ ہوا، لیکن چند ہی قدم چل کر رک جانا پڑا، اب یکم رمضان المبارک ۱۳۶۳ھ کو دوبارہ عزم درست کے ساتھ چلنے کی تیاری ہے۔ مگر انجام عالم الغیب کو معلوم ہے"۔[3]

---

[1] معارف شذرات ج ۴۵ نمبر ۲ فروری ۱۹۴۰ء [2] سیرۃ النبی جلد ہفتم (مقدمہ) ص ۵ طبع پنجم ۱۴۰۶ء [3] ایضاً ج ۷، ص ۶۔

ان تفصیلات سے کام کی نزاکت اور اہمیت ظاہر ہوتی ہے، دوسری طرف واقعہ ہے کہ یہی وہ زمانہ تھا جب سیرت نگار پر وہ زمین تنگ ہو رہی تھی جس سرزمین پر اسی موضوع کی تکمیل کے لئے اپنے استاذ مرحوم مولانا شبلی نعمانی ؒ کی وصیت پوری کر رہے تھے۔ اس دردناک آزمائشی دور سے قطع نظر اس موضوع پر جتنا کام ہو سکا ہے اور جلد ہفتم کے نام سے جو اجزا شایع ہو چکے ہیں۔ یہاں ان کے افادی پہلو کو نمایاں کیا جا رہا ہے۔ اس جلد کے مقدمہ نگار حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ؒ نے بجا تحریر فرمایا ہے کہ:

"وہ (سید صاحب) اس کی تکمیل نہ کر سکے تھے کہ ان کی کتاب زندگی کا آخری ورق الٹ گیا اور وہ اس کتاب کو مکمل نہ کر سکے، لیکن انہوں نے جس پیمانہ پر اس کام کو اٹھایا تھا اور ان کے سامنے کتاب کا جو خاکہ اور منصوبہ تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ کتاب مکمل ہو جاتی تو نہ صرف سلسلہ سیرۃ النبی کی تکمیل ہو جاتی بلکہ ان کے علمی اور ذہنی کمالات، وسعتِ نظر، جامعیت، اعتدال و توازن، احتیاط و ورع شریعت اسلامی کی روح و مزاج سے آشنائی، قدیم و جدید کی واقفیت، دین کے اولین و مستند ترین ماخذ سے نہ صرف براہ راست واقفیت بلکہ ان میں اعلیٰ درجہ کی بصیرت رکھنے اور اس علمی و فکری پختگی کی بنا پر (جو اس درجہ میں ان کے بہت کم معاصرین کو حاصل ہوگی) جو چیز تیار ہوتی اس میں شریعت اسلامی اور تعلیمات نبوی کی بہتر سے بہتر نمائندگی اور ترجمانی ہوتی، افراط و تفریط سے پاک، تجدد و آزاد خیالی کے ہر شائبہ سے محفوظ اور اسی کے ساتھ جمود و تنگ نظری سے بھی پوری طرح بری ہوتی اور اس میں ان صدہا سوالات کا جواب بھی ہوتا جو عصر حاضر کے ذہن اور حالات و مسائل کے مطابق کسی جامع کتاب کے نہ ہونے سے تشنۂ جواب رہتے ہیں"۔[1]

بہرحال مشیت ایزدی یہی تھی کہ یہ کتاب اس ضخامت کی حامل نہ ہو سکی جو پہلی جلدوں کو حاصل تھی، تاہم اس کا مطالعہ کرنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ یہ اوراق جو دستیاب ہوگئے وہ علمی اور تحقیقی میدان میں انفرادی

---

[1] سیرۃ النبی جلد ہفتم (پیش لفظ) ص ۲۔

مقام رکھتے ہیں جن کا کوئی سراغ اس جامعیت کے ساتھ کہیں اور نہیں ملتا۔

سید صاحب نے مقدمہ میں موضوع کی وضاحت پورے تحقیقی انداز میں کی ہے۔ معاملات کے حدود فقہا کی نظر میں، اور ان کے اقسام اور ان سے پیدا شدہ مباحث پر سیر حاصل گفتگو کی ہے اور اس سلسلہ میں جو مصادر اور مآخذ علمیہ دستیاب ہیں ان کو سامنے رکھتے ہوئے سید صاحبؒ نے موجودہ زمانہ میں مسائل کی ترتیب بیان کی ہے جو اگلے بزرگوں کے طرز بیان سے مختلف ہیں اور ان کے لئے اصطلاحیں بھی نئی اختیار کی ہیں اور تحریر فرمایا ہے کہ "اب ہماری نئی اصطلاح میں معاملات سے مقصود مسلمانوں کے وہ تمام انسانی کاروبار ہیں جن کا تعلق معاشرت، مال و دولت اور حکومت کے ضابطوں اور قوانین سے ہے"[1]

اس کے بعد اس کام میں جو اشکالات ہیں ان کو بھی سامنے رکھا ہے، دیگر مذاہب میں معاملات اور اس کی مشکلات کو کس طریقہ سے حل کیا گیا؟ عیسائیت، بدھ مذہب اور موجودہ عصر میں جس طریقہ سے معاملات میں پیدا ہونے والی مشکلات کا حل تلاش کیا گیا ہے، اس کا جائزہ لیا گیا ہے اور قانون سازوں کی بے چارگی، جمہوریت کی ناکامی، صحیح اور عادلانہ قانون سازی سے انسانیت کی ناچاری اور اس طرح کے ذیلی عنوانات قائم کرنے کے بعد قانونِ الٰہی کی ضرورت کو واضح کیا ہے۔

جہاں سے وہ شریعتِ اسلامیہ کے پیش کردہ حل یا یوں کہئے کہ معاملات کو اسلام نے جس طریقہ سے حل کرنے کی دعوت دی ہے اور قرآن کریم اور احادیث نبویہؐ سے جو راستے کھلتے ہیں ان کا بیان جس دلآویز اور انوکھے انداز میں سید صاحبؒ نے کیا ہے، اس کا سلف و خلف میں سے کسی نے اتنی جامعیت کے ساتھ جائزہ نہیں لیا تھا۔

سید صاحبؒ نے معاملات میں توازن کے احکام جہاں سے لئے ہیں اور جس کو بنیاد بنا کر آیات و احادیث اور واقعاتِ سیرت جمع کئے ہیں وہ لفظ "میزان" ہے، سورۂ رحمٰن کی ابتدائی آیات نقل کرتے

[1] سیرۃ النبی جلد ہفتم (دیباچہ طبع اول) ص ۴۔

ہوئے "وَاَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ" کو معیار قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ دنیا کی سب سے بڑی ترازو ہے، اسی سے دنیا میں اعمال اور معاملات تولے جاتے ہیں، اسی کے اعتدال اور اونچ نیچ کا نام حق اور باطل، انصاف اور ظلم، صحیح اور غلط ہے، اس لئے اس پیمانہ اور ترازو کو ہمیشہ سچائی اور انصاف کے کانٹے پر رکھو"[1]

اس کے علاوہ سورۂ انعام، سورۂ اعراف اور سورۂ ہود کی آیات جن میں "میزان" کا ذکر آیا ہے کو نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

"ان آیتوں میں ناپ اور تول سے معمولی لین دین اور خرید و فروخت کی اشیاء بھی مراد لی جاسکتی ہیں اور لی گئی ہیں"[2]

اتنا لکھنے کے بعد اب سید صاحبؒ کے قلم مبارک سے جو عبارت نکلتی ہے وہ ان کی تحقیقی عظمت اور بلند نظری اور قرآن فہمی کو آفتاب کی روشنی کی طرح چمکا دیتی ہے۔ فرماتے ہیں:

"لیکن اس پیمانے کو وسیع کیجئے تو سارے انسانی معاملات اس ترازو اور پیمانہ میں سما جاتے ہیں، ہر انسانی ظلم کا تخم یہ ہے کہ انسان اپنے لئے ایک پیمانہ اور دوسرے کے لئے دوسرا پیمانہ چاہتا ہے، وہ اپنے لئے ایک ترازو سے ناپتا ہے اور دوسروں کے لئے دوسرے ترازو سے"[3]

سچ یہ ہے کہ اس وقت دنیا کے کسی مذہب اور کسی طریقۂ زندگی میں بھی مساوات کا یہ معیار نہیں ملتا ہے، وہ ملک جو عالمی پیمانہ کا اعلان عدل کرتے ہیں وہاں بھی ایک پیمانہ نہیں ہے اور قدیم مذاہب میں بھی اہلِ ثروت اور اہلِ حکومت کے لئے ایک پیمانہ تھا اور غریبوں اور مزدوروں کے لئے دوسرا پیمانہ، مزدوروں کی حمایت کرنے والے یا یوں کہئے مزدوروں کے نام کا استحصال کرنے والے اور "سرمایۂ محنت" کے اصل مالکوں کو حق دلانے کا دعویٰ کرنے والوں نے اپنے ستر سالہ دورِ حکومت میں ایک دن

[1] سیرۃ النبی ج ۷، ص ۱۰۔ [2] ایضاً ص ۱۱ [3] ایضاً۔

کے لئے بھی یکساں حقوق تمام انسانوں کو نہیں دیئے۔ اس کے بعد سید صاحبؒ نے آیت کریمہ:

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا	پھٹکار ہے ان کم کر دینے والوں پر جو اپنے
عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ وَإِذَا كَالُوا	لئے لوگوں سے ناپ پوری لیتے ہیں اور جب
هُمْ أَوْ وَّزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ.	ان کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کم کر دیتے
(تطفیف: ۱ تا ۳)	ہیں۔

کو استدلال کے طور پر پیش کیا ہے۔

دوسری سورۂ حدید کی آیت نقل کر کے فرماتے ہیں کہ زمین میں قیام عدل کے تین ذریعے بتائے گئے ہیں:

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ	اور ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی نشانیوں کے
وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ	ساتھ بھیجا اور ان پیغمبروں کے ساتھ کتاب
لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَأَنْزَلْنَا	اتاری اور (عدل کی) ترازو، تاکہ لوگ انصاف
الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَ	پر قائم رہیں اور ہم نے لوہا اتارا جس میں سخت
مَنَافِعُ لِلنَّاسِ۔ (رکوع ۳)	ہیبت ہے اور لوگوں کے لئے کئی فائدے ہیں۔

اس آیت میں قیام عدل اور انسداد ظلم کے لئے تین چیزیں بیان کی گئی ہیں، ایک احکام الٰہی کا مجموعہ یعنی کتاب الٰہی، دوسری چیز وہ فطری صحیح وعادلانہ میزان جو ہر صداقت شعار کے دل میں دھری ہے اور جس پر مبنی ہر انصاف قوانین کی بنیاد کھڑی ہے۔ تیسری شئے تلوار کی طاقت ہے جو ان دونوں کے ماننے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ استنباط سید صاحبؒ کے قرآن فہمی کا بہترین نمونہ ہے۔ سید صاحبؒ نے قانون الٰہی کی دائمی یکسانی وفطری حقوق اور معاملات کی یکسانی پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ قانون کا بنیادی تخیل قانون الٰہی کی بنیاد اور اس کی عمومیت کی تفصیل کرتے ہوئے علامہ عزالدین بن عبدالسلام

مصری (م ۶۶۰ھ) کی کتاب "قواعد الاحکام فی مصالح الانام" اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ کی "حجۃ اللہ البالغۃ" میں ابواب معاملات کی طرف قاری کو متوجہ کیا ہے، غرض معاملات کے حدود علمی اور فنی، عقلی اور وجدانی باوجود اختصار کے پوری وضاحت کے ساتھ ان اوراق میں آ گئے ہیں۔

کتاب سیرت نبویؐ پر ہے اس لئے صرف عقلی اور دنیا کے باطل قوانین کو سامنے رکھ کر اسلامی قانون کی برتری نہیں دکھائی ہے بلکہ پوری تفصیل کے ساتھ انبیائے کرام کے طرز عمل اور اسوہ کو قرآن کریم کے حوالہ سے ذکر کیا ہے اور دکھلایا ہے کہ اسلام میں حکومت کی حیثیت واہمیت کیا ہے اور یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دین ودنیا دونوں کی برکتیں لے کر تشریف لائے اور صرف آسمانی بادشاہی کی خبر نہیں سنائی بلکہ آسمانی بادشاہی کے ساتھ دنیا کی بادشاہی کی بھی بشارت دی ہے تاکہ دنیا میں خدا کی بندگی اور رضا جوئی بے خوف وخطر ہو سکے اور اس لئے خدا کی بادشاہی خدا کے قانون کے مطابق دنیا میں قائم ہو۔

سید صاحب فرماتے ہیں کہ ان آیتوں سے یہ اشارہ بھی نکلا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں خدا کے قانون کے اجرا کی طاقت ہونی چاہئے۔ چنانچہ اسلام میں سارے حدود وتعزیرات اسی منشاء کے مطابق ہیں۔ حدود کی تنفیذ بھی اسی وقت ممکن ہے جب خدا کے قانون کے اجرا کی قوت موجود ہو، نجران کے عیسائیوں سے آپ نے صلح کا جو معاہدہ کیا تھا اس کی ایک دفعہ یہ تھی کہ اگر وہ سودی لین دین کریں گے تو یہ معاہدہ ختم ہو جائے گا۔ جو لوگ اسلامی ملک میں بغاوت کریں، ڈاکہ ڈالیں، لوٹ مار کریں، اس کو خدا اور رسول سے لڑنا کہا جائے گا۔ ڈاکہ زنی، لوٹ مار اور اس کی سزا پھانسی قطع ید اور قید یا جلاوطنی ہے اور ان کی بے کسی اور بے بسی کی کیفیت کو عذاب دنیوی ورسوائی کہا گیا: "ذَٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ"۔ حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کی مثالیں دی ہیں، جہاں بنی اسرائیل پر فرعونی مظالم کی تفصیل ہے، وہاں جگہ جگہ یہ تشفی بھی دی گئی ہے کہ قانون الٰہی ایک نہ ایک دن غالب آ کر رہے گا اور مظلوم اپنا حق اللہ کی دی ہوئی طاقت سے حاصل کریں گے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنے پیش لفظ میں سید صاحبؒ کے ذہنی توازن اور ان کی شخصیت کے فطری امتیازات کے باقی رہنے کی یہ دلیل پیش کی ہے کہ وہ حکومت کو ناقابل التفات اور جسمانی گوشہ نشینی و انقطاع اور ذہنی عزلت کو دین نہیں سمجھتے تھے۔ حضرت مولانا علی میاںؒ سید صاحبؒ کا یہ جملہ نقل فرماتے ہیں "اس دنیا میں اللہ کی بڑی نعمت حکومت و سلطنت اور دنیا کی سیاست ہے یہاں تک کہ کتاب و نبوت کی دولت کے بعد اسی کا درجہ ہے۔ پھر اس کے ثبوت میں آیات بینات بھی جمع کردی ہیں جو سیرۃ النبیؐ کے مصنف کا قدیم شیوہ ہے لیکن پھر ان کا اصلی مطالعہ اور اسلامی تحریکات نے جو لٹریچر پیدا کیا ہے اس کی واقفیت ان کا قلم پکڑ لیتی ہے اور ان کے قلم سے حسب ذیل الفاظ نکلتے ہیں اور اس طرح وہ لاسخین فی العلم والدین کی پوری ترجمانی کرتے ہیں" اسلام کے سارے دفتر میں ایک حرف بھی ایسا موجود نہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ قیام سلطنت اس دعوت کا اصل مقصد تھا اور عقائد و ایمان شرائع و احکام اور حقوق و فرائض اس کے لئے بمنزلہ تمہید تھے، بلکہ جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ شرائع اور حقوق و فرائض ہی اصل مطلوب ہیں اور ایک حکومتِ صالح کا قیام ان کے لئے وجہ اطمینان اور سکونِ خاطر کا باعث ہے تاکہ وہ احکام الٰہی کی تعمیل باسانی کرسکے۔ اس لئے وہ عرضاً مطلوب ہے"[1]

گویا سید صاحبؒ نے حصول حکومت کے لئے جدوجہد کو دینی مقاصد سے خارج نہیں قرار دیا اور نہ اس کی اہمیت سے انکار کیا بلکہ صرف اتنا بتلایا ہے کہ بعثت انبیاء کا مقصد دنیوی دولت و حکومت کا حصول نہیں تھا۔ مقصد تو اللہ کی عبادت اور صرف اسی کی ذات کو خالق اور آمر ماننا ہے اور اللہ کے بنائے ہوئے قوانین کو زمین پر رائج کرنا، لیکن اس نعمت کے حصول کے لئے طاقت کا حصول ضروری ہے، ہم اس کو یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ جیسے ہر عبادت میں کچھ فرائض ہیں اور کچھ شرائط۔ مثلاً نماز کے لئے وضو، زکوٰۃ کے لئے مال کا ہونا شرائط میں داخل ہے۔ لہذا یہ نہیں کہہ سکتے کہ تمام انبیاء کی بعثت اس لئے

[1] سیرۃ النبی جلد ہفتم ص ۵ و ۶ (پیش لفظ)

ہوتی تھی کہ لوگ طہارت کا اہتمام کریں لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ عبادت جو اصل مقصود ہے اس کے لئے طہارت شرط ہے۔ حج اور زکوٰۃ کے لئے استطاعت مادی شرط ہے۔ اگر کسی کے پاس مال نہ ہو تو اس پر نہ حج فرض ہے اور نہ زکوٰۃ۔ تو حلال کمائی کا پیدا کرنا اور جسمانی طاقت کا حصول روح اور جوہر کی طرح مطلوب اولیٰ نہیں ہے لیکن عرضاً عبادات کے حصول کا ذریعہ ہے۔

سید صاحبؒ نے حکومت کی حیثیت و اہمیت کی وضاحت میں جن آیات کو پیش کیا ہے ان میں حضرت موسیٰؑ کا اپنی قوم سے یہ کہنا:

يَا قَوْمِ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَعَلَ فِيكُمْ أَنْبِيَاءَ وَجَعَلَكُمْ مُلُوكًا (المائدہ: ۲۰)

اے میرے لوگو! اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو جب تم میں نبی بنائے اور تم کو بادشاہ بنایا۔

حضرت موسیٰؑ کی پیشین گوئی جو خبر کی صورت میں ہے حضرت طالوت بادشاہ اور حضرت داؤدؑ و حضرت سلیمان علیہما السلام کے زمانہ میں پوری ہوئی۔ طالوت کی نسبت خبر دی گئی:

إِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا (البقرہ: ۲۴۷)

بے شبہ خدا نے طالوت کو تمہارا بادشاہ مقرر کیا۔

لوگ اس پر معترض ہوئے تو فرمایا "وَاللّٰهُ يُعْطِي مُلْكَهُ مَنْ يَشَاءُ" حضرت داؤد کو خطاب ہوا۔ يَا دَاوُودُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ۔ (ص: رکوع ۲) اے داؤد ہم نے زمین میں تم کو بادشاہ بنایا ہے۔ حضرت سلیمانؑ نے اس نعمت میں مزید وسعت کی دعا فرمائی:

رَبِّ اغْفِرْ لِي وَهَبْ لِي مُلْكًا لَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ مِنْ بَعْدِي۔ (ص: ۳۵)

اے میرے پروردگار میری مغفرت کر اور مجھ کو ایسی بادشاہی عطا فرما کہ میرے بعد کسی کو شایاں نہ ہو۔

یہ نعمت کسی انسان کے دینے لینے سے نہیں ملتی۔ اس کا مالک اللہ تعالیٰ ہے وہ جس کو چاہے دے اور جس سے چاہے چھین لے:

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي — اے اللہ۔ اے سلطنت کے مالک! تو

الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ — جسے چاہے سلطنت بخشے اور جس سے چاہے

مِمَّنْ تَشَآءُ (آل عمران: ۲۶) — سلطنت چھین لے۔

علامہ اقبال نے اسی آیت کی روشنی میں یہ شعر کہا ہے جو تمام تاریخ الملوک پر نظر رکھنے والے کے مشاہدہ کی چیز ہے ؎

سطوت از کوہ ستانند و بکاہے بخشند — کلہ جم بگدائے سرِ راہ بخشند

یعنی قوت و جبروت پہاڑ سے چھین کر جب چاہتے ہیں ایک تنکہ کو بخش دیتے ہیں اور تاجِ شاہی جب چاہتے ہیں ایک راستہ چلتے بھیک منگے کو دے دیتے ہیں۔

سید صاحبؒ نے اس طرح کی تمام آیات کو جمع کرکے یہ دکھایا ہے کہ دنیا میں حکومت کی طلب اسلامی قانون کو نافذ کرنے کے لئے ضروری ہے اور انبیائے کرام نے اس کی دعا کی ہے اور اس کے حصول کے لئے کاوش کی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کو انعام اور معجزے کے طور پر حضرت موسیٰؑ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کو عطا فرمایا اور خود جناب رسول کریم سیدنا مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بے چارگی اور بے مائیگی کی زندگی سے نکال کر عرب و عجم کی دولت ان کے قدموں میں ڈال دی اور حکومت ان کے ماننے والوں کے دست تصرف میں عطا فرما دی۔ لہٰذا یہ کہنا کہ حکومت قطعاً مطلوب نہیں ہے اور اس کی طلب سے کنارہ کش رہنا دینداری ہے غلط ہے۔ اس مسئلہ کی علمی وضاحت جس وسیع انداز میں سید صاحبؒ نے کی ہے کسی کی نظر وہاں تک نہیں گئی اور بعض لوگوں کا یہ احساس کہ سید صاحبؒ آخر عمر میں تصوف کی طرف مائل ہو گئے تھے اس لئے اس کتاب کی تکمیل

نہیں کر سکے ایک الزام ہے۔ کیونکہ یہ کتاب اگرچہ مکمل شکل میں ہمارے سامنے نہیں آئی لیکن جو مباحث آئے ہیں ان سے ثابت ہو گیا کہ گوشہ نشینی اور دنیا کی ہوس سے علیحدگی اور خلق سے منھ موڑ کر خالق کی طرف قلبی یکسوئی میں اور اقامتِ حکمِ الٰہی میں تضاد نہیں ہے۔

دراصل یہ باب سینکڑوں کتابوں کا نچوڑ اور بڑی وسعت نظر کا نتیجہ ہے۔ اس کے بعد سید صاحبؒ نے "عہد نبویؐ میں نظام حکومت" کے عنوان سے ایک باب قائم کیا ہے۔ اس میں احادیث نبویؐ سے جو واقعات و حقائق پیش کئے ہیں وہ سیرت نبویؐ کے ایسے اجزا ہیں جن سے آپؐ کی ذات گرامی کی عظمت پڑھنے والے کے دل پر جم جاتی ہے۔ معاملات کے تعلق سے شروع کتاب میں "میزان" کے لفظ سے جو حقیقت آشکارا کی تھی وہ حضورؐ کی زندگی میں نہایت درجہ پختگی کے ساتھ اور ناقابلِ انکار حقائق کے طور پر موجود تھی جس کی مثال چشم فلک نے تاریخ کے کسی دور میں اور کسی حکمراں کی سیرت میں نہیں دیکھی۔ ہم مجبور ہیں کہ یہاں پر سیرۃ النبیؐ کی اس جلد سے ایک طویل عبارت نقل کریں۔ کیونکہ اختصار و التقاط سے مدعا پوری طرح واضح نہیں ہو سکتا۔ سید صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"سلاطین شاہانہ شان و تجمل سے اونچے اونچے محلوں اور ایوانوں میں بڑے بڑے قیمتی لباسوں اور سونے چاندی اور لعل و جواہر کے زیوروں سے آراستہ ہو کر اونچے اونچے بیش بہا تختوں پر جلوس کرتے تھے اور ان کے امرا علی قدر مراتب سونے چاندی کی مرصع کرسیوں پر اور ریشمی گدوں پر بیٹھتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے یک قلم ان مصنوعی تفرقوں کو مٹا دیا۔ نشست کے لئے سونے چاندی کے سامان اور ریشمی لباس و فرش حرام کئے گئے۔ سونے چاندی کے زیورات مردوں کے لئے ناجائز ٹھہرے، امام وقت اور اس کے حکام کے لئے مسجد اور اس کا صحن ایوان بنا، حاجب و دربان کے پہرے اٹھ گئے، چاؤش و نقیب رخصت کر دئے گئے، طلائی و نقرئی و زمردیں تخت اٹھا دئے گئے۔ امام اور اس کے حاکم عام مسلمانوں کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر نشست کرتے تھے اور

پستی و بلندی کی تفریق باقی نہیں رکھی گئی۔ چنانچہ وضع لباس کے لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور عام صحابہ میں کسی قسم کا فرق مراتب موجود نہ تھا۔ ایک مرتبہ ایک صحابی ایک شاہی عبا لے کر آئے، چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرب کے مختلف حصوں سے وفود حاضر ہوا کرتے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ اسے خرید لیں تاکہ جب دوسرے شہروں یا ملکوں سے وفود آپ کی خدمت میں آئیں تو آپ اس کو زیب تن فرمالیں یا جمعہ کے دن جو گویا مسلمانوں کے دربار عام کا دن ہے آپ اس کو پہنیں اس وقت حضرت عمرؓ کی نظر اسلام کے لئے اس ظاہری جاہ و جلال اور تزک و احتشام پر گئی جس کے شاہان وقت عادی تھے، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اشتباہ کے اس پردے کو فوراً چاک کر دیا کہ مسلمانوں کا پیغمبر شاہانہ جاہ و جلال کے اظہار کے لئے مبعوث نہیں ہوا ہے، آپ نے فرمایا کہ جو شخص اس کو پہنتا ہے آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں ہے۔

اسی طرح نشست میں بھی آپ نے تفوق و برتری کے امتیاز کو اس قدر مٹایا کہ مجلس کے اندر آپ میں اور ایک عام آدمی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب صحابہ کی مجلس میں بیٹھتے تو باہر سے آنے والے کو پوچھنا پڑتا کہ تم میں کون محمدؐ ہیں؟ لوگ اشارے سے بتاتے، صحابہ نے چاہا کہ کم از کم ایک چبوترہ ہی بنا دیا جائے جس پر آپ جلوہ افروز ہوں، مگر اس کو بھی آپ نے پسند نہیں فرمایا۔

اس وقت کی شاہانہ حکومتوں میں بادشاہ اور شاہی خاندان کے افراد قانون کی زد سے مستثنیٰ تھے، مگر یہاں یہ حال تھا کہ ہر قانون الٰہی کی تعمیل کا اصل نمونہ اس کا رسول اور اہل بیت رسول تھے، اور اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ اگر نعوذ باللہ اہل بیت سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو تو ان کے لئے دوہری سزا ہے، ایک مرتبہ ایک مخزومی خاتون فاطمہ بنت قیس نے چوری کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا

ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، چونکہ وہ معزز خاندان کی بی بی تھیں اصحاب کو یہ گراں گزرا اور انھوں نے آپ کی خدمت میں حضرت اسامہ بن زیدؓ کے ذریعہ سے سفارش کرانی چاہی آپ نے فرمایا تم سے پہلے کی قومیں اسی لئے تباہ ہوئیں کہ جب کوئی معمولی آدمی کوئی جرم کرتا تھا تو اس کو اس کی سزا دے دی جاتی تھی، مگر جب وہی جرم بڑے رتبہ کے لوگ کرتے تھے، تو ان کو چھوڑ دیتے تھے، پھر فرمایا کہ اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہ بھی یہ جرم کرتی تو میں یقیناً اس کا ہاتھ کاٹتا[1]

غرض یہ دکھانے کے لئے کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں ایک ہی معیار تھا صحاح کی کتابوں سے حضرت سید صاحب نے متعدد حدیثیں تفصیل کے ساتھ اس طرح نقل فرمائی ہیں جس سے سیرت نبوی کی جلالت شان آئینہ کی طرح سامنے آجاتی ہے اور اس جلد کے بارے میں شروع میں جو یہ خیال ہو رہا تھا کہ صرف اصولی اور فقہی مباحث پر مشتمل مضامین ہوں گے، جب ان ابواب کو پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سیرت پاک کا ایک اہم ترین پہلو کھل کر سامنے آرہا ہے۔ مساوات اور ہر مختنی کو اس کا حق دے جانے کی تعلیم اس قدر تفصیل کے ساتھ نظروں کے سامنے آجاتی ہے کہ سیرت کے بارے میں ایک اعلیٰ ترین تصور جو سامنے نظر آنا چاہئے اس کو ہم موجود پاتے ہیں۔ صفحہ ۴۳ تک قرآن کریم کی آیات مصنف نے پیش کی تھیں اور سیرت کے ان گوشوں کو احکام الٰہی کی روشنی میں دکھانے کی سعی کی گئی تھی۔ اس کے بعد صفحہ ۴۴ سے لے کر اس باب کے آخر تک احادیث نبویہ سے ماخوذ وہ واقعات ہیں جن کو قرآن کی عملی تصویر کہئے۔ یہ سیرت پاک کے وہ حصے ہیں جن کو صرف مسلمانوں ہی کے سامنے نہیں بلکہ غیر مسلموں کے سامنے پورے اعتماد کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے اور دنیا کے ہیروؤں (ابطال) کی تاریخ جس کا ایک حصہ بھی پیش کرنے سے قاصر ہے۔

سیرت نگار نبویؐ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس کے بعد سلطنت اور دین کا تعلق بیان کیا ہے پہلے

---

[1] سیرۃ النبی ج ، ص ۳، ۳۷۵۔

دکھایا ہے کہ سلطنت کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جس میں سلطنت کو مذہب سے قطعاً الگ رکھا گیا ہے اور دوسری قسم وہ ہے کہ سلطنت کو مذہب سے جدا نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن سید صاحبؒ کے الفاظ میں "مذہب کی لطیف اور نازک روح کو سلطنتی قوانین و آئین و ضوابط کی رسیوں میں اس طرح جکڑ دیا گیا کہ مذہب کی لطافت جاتی رہی اور رسوم و قوانین کی خشکی نے اس کی جگہ لے لی۔ یہودیت اور برہمنیت اس کی بہترین مثالیں ہیں"۔ اس کے بعد سید صاحبؒ نے "ان الدین عند اللہ الاسلام" کو بنیاد بنا کر یہ دکھایا ہے کہ اصل دین الٰہی ایک ہی ہے اور ایک ہی رہا ہے اور ازل سے ابد تک ایک ہی رہے گا اور وہ اسلام ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا کے سب سے آخری داعی، نبی اور پیغمبر تھے اور وہی اس سلطنت کے سب سے پہلے امیر، حاکم اور فرماں روا تھے، آپؐ کے احکام کی بجا آوری عین احکام خدا کی بجا آوری ہے "مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (نساء: ۸۰) سید صاحبؒ نے اس آیت کے مفہوم و مقتضی کو بیان کرنے کے بعد یہ دکھایا ہے کہ آپؐ کے بعد صحابہ کرامؓ نے جانشینی کا حق اس طرح ادا کیا کہ وہ دین کے پیشوا، امام اور مجتہد تھے اور ان کے احکام کی تعمیل بھی عین خدا اور رسول کے احکام کی تعمیل تھی، اس سلسلہ میں صحیح بخاری کتاب الاحکام کی ایک حدیث جس کو امام مسلم نے اپنی صحیح کی کتاب الامارۃ میں نقل کیا ہے۔ سید صاحبؒ نے بطور دلیل کے نقل فرمائی ہے کہ "جس نے امیر کہا مانا اس نے میرا کہا مانا اور جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی"۔ سید صاحبؒ نے اس کی تشریح کرنے کے بعد قرآن کریم کی ایک خاص آیت جو حضرت داؤدؑ کے متعلق ہے اور جس کی تفسیر قصہ گو مفسرین نے اسرائیلی روایات سے متاثر ہو کر بڑی رنگ آمیزی کے ساتھ اور پیچیدہ طریقہ سے بیان کی ہے اور بعض صوفیہ نے اور بھی رنگ آمیزی سے کام لیا ہے، لیکن سید صاحبؒ نے جو مفسر اور محدث پہلے تھے اور جن کا تصوف احکام الٰہی اور سنت نبویؐ کا پابند تھا کس طریقہ سے اس آیت کو پیش کیا ہے اور کیا نتیجہ نکالا ہے۔ اہل علم کے دیکھنے کی چیز ہے۔ سید صاحبؒ فرماتے ہیں:

"حضرت داؤدؑ کا جو قصہ سورہ "ص" میں ہے جس میں چند دادخواہوں کا دیوار پھاند کر حضرت داؤد علیہ السلام کے عبادت خانہ میں داخل ہو جانے اور ایک مقدمہ کے پیش کرنے کا ذکر ہے، قصہ خوانوں نے اس کو ایک بے ہودہ کہانی بنا دیا ہے، حالانکہ وہ ان کی تنبیہ اس باب میں ہے کہ فرائض کی ادائیگی کے بعد خلیفہ کی سب سے بڑی عبادت رعایا کی خدمت، ان کے معاملات کی دادگری اور ان کے کاموں کی نگرانی ہے اور یہی احساس فرض ہے جس پر حضرت داؤدؑ کو متنبہ کیا گیا:

وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ۔ يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ (سورہ ص: ۲۴-۲۶)	اور داؤد نے سمجھا کہ ہم نے (یعنی خدا نے) ان کو آزمایا ہے تو اپنے پروردگار سے انہوں نے معافی چاہی اور رکوع میں گر گئے اور رجوع کیا تو ہم نے ان کو معاف کر دیا اور ان کو ہمارے یہاں قرب کا درجہ اور پھر آنے کی اچھی جگہ حاصل ہے اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکم کرو اور خواہش نفس کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تم کو اللہ کے راستہ سے ہٹا دے گا۔

آگے پیچھے کی آیتوں کے درمیان ربط و نظم سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام سلطنت کے فرائض اور مقدمات کے فیصلوں کو چھوڑ کر اپنے عبادت خانہ کے دروازہ کو بند کر کے خدا کی عبادت میں مصروف رہنے لگے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو تنبیہ کی گئی اور بتایا گیا کہ

خلیفہ کا فرض یہ ہے کہ حسب احکام الٰہی فرائض خلافت کی ادائیگی میں مصروف رہے[1]

خلفائے راشدین اور ان کے بعد مسلم سلاطین جن کے بہت سے اعمال خلفاء کے نقش قدم پر تھے، انہوں نے عدل کو اپنا ہنر نہیں سمجھا اور نہ کسی پر احسان جتلایا کہ وہ عدل اور راست بازی کی راہ پر قائم ہیں بلکہ اس کو اپنا فرض سمجھا اور اگر اس میں کوئی معمولی کوتاہی کا شبہ ہوتا تو اس کو اپنا بدترین گناہ تصور فرماتے، قرآن کریم کی وہ آیات جو عدل پر آمادہ کرتی ہیں اور ظلم کو معصیت قرار دیتی ہیں ان کو بیان کرنے کے بعد احادیث نبویہ کے دفتر سے وہ واقعات تلاش کر کے جمع کئے ہیں جن کو پڑھ کر آج دنیا کی تمام حکومتوں کو اور تمام طاقتوروں کو چیلنج کیا جا سکتا ہے۔

حضرت معقلؓ بن یسار ایک صحابی ہیں، ان کے مرض الموت میں بصرہ کا سفاک حاکم عبیداللہ بن زیاد ان کی عیادت کے لئے آیا، حضرت معقلؓ نے فرمایا کہ آج میں تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک پیغام سنا دینا چاہتا ہوں، اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میری زندگی ابھی اور باقی ہے تو میں نہ سناتا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے "جس بندہ کو اللہ کسی رعیت کا نگراں بنائے وہ مرتے دم اس حال میں مرے کہ وہ اپنی رعیت کے ساتھ غداری کرتا تھا تو اللہ اس پر جنت حرام کر دے گا"۔ سید صاحب نے اس واقعہ کو اس لئے نقل کیا ہے کہ یہ دکھائیں کہ امارت و حکومت کی ذمہ داری اسلامی شریعت میں کتنی بڑی ہے، ایک اور صحابی جن کا نام عائذ بن عمروؓ ہے وہ مرض الموت کا بھی انتظار نہیں کرتے، ابن زیاد کے دربار میں خود پہنچ جاتے ہیں اور پیار سے خطاب کر کے کہتے ہیں کہ اے بیٹے! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ان شر الرعاء الحطمۃ، کہ سب سے برا راعی (امیر) وہ ہے جو اپنی رعیت کو توڑ ڈالے، لہذا تو ان میں سے نہ بن"۔

[1] سیرۃ النبی ج ۷، ص ۱۲۹ و ۱۳۰

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "بنی اسرائیل کی سیاست انبیاء کرتے تھے، ایک نبی گزر جاتا تو دوسرا نبی اس کا جانشین ہوتا، لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ نبوت مجھ پر ختم ہوگئی، البتہ خلفاء ہوں گے اور بہت ہوں گے، انہی کے ہاتھ میں امت کی سیاست کی باگ ہوگی، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! تو ہمارے لئے کیا حکم ہے؟ تو فرمایا پہلے کی بیعت کرو، پھر اس کے بعد والے کی، پھر عہد بعد اوروں کی۔ ان کا حق ان کو ادا کیا کرو (یعنی اپنے حق کی پرسش خدا پر چھوڑ دو)۔ فان اللہ سائلھم عما استرعاھم۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ان سے ان کے متعلق باز پرس فرمائے گا جن کی نگرانی ان کے سپرد فرمائی ہے۔

سید صاحبؒ نے صرف بادشاہ ہی نہیں بلکہ ہر اس شخص کی ذمہ داری جو کچھ لوگوں پر غالب ہے اور جس کی بات مانی جاتی ہے بتائی ہے کہ ہر ایک پر اپنے اپنے دائرہ حکومت کی ذمہ داری ہے اور ایک مشہور حدیث سے ایسا استدلال کیا ہے جو معلوم ہوتا ہے کہ اسی مقصد کے لئے زبان نبوت سے نکلی تھی۔ الا کلکم راع و کلکم مسئول الخ (صحیح بخاری و مسلم)

سید صاحبؒ نے لفظ "رعیت" کی وہ عالمانہ تحقیق پیش کی ہے جو ان ہی کا حصہ تھا اور اس سے جو نکتہ نکالا ہے یہ بھی ان کی عالمانہ بصیرت کا نمونہ ہے۔ فرمایا کہ "رعیت" پرورش کرنے کو کہتے ہیں، جو جانوروں کے لئے ہوا کرتی ہے۔ جانوروں کو چراگاہ لے جانا، بدکنے اور بھٹکنے نہ دینا، کسی دوسرے کی کھیتی کی طرف نکل جانے سے روکنا اور اس کو شکم سیر کرا کے بحفاظت واپس لانا۔ یہ ایک جامع لفظ ہے جو راعی اور رعیت کے رشتہ کو بتاتا ہے۔ سید صاحبؒ نے یہ دکھلایا ہے کہ اصل میں راعی کی رعیت کے ساتھ شفقت ایک لازمی عنصر ہے، لہذا جب یہ صفت انسانوں کے لئے استعمال ہوگی جیسا کہ "کلکم راع و کلکم مسئول" والی حدیث میں ہے، تو اس میں بھی رعیت کے ساتھ رحم و کرم اور انسانی سلوک کی ہدایت ملتی ہے۔ ایسا نہیں ہے جو بادشاہوں، راجاؤں،

زمینداروں کا طریقہ رہا ہے کہ اپنے عیش و آرام کے لئے غریبوں، کسانوں، مزدوروں کو آدمی ہی نہ سمجھا جائے اور جانوروں کی طرح ان سے بار برداری کا کام لیا جائے۔ اسلام کے علاوہ جہاں بھی انسانوں کے ہاتھ میں اقتدار رہا ہے اور ہے، وہ انسانوں کے حقوق کا قائل نہیں ہے۔ راقم حروف کے نزدیک افریقی ممالک کے وہ سیاہ فام انسان بھی ہیں جن کو یورپ کے مال داروں نے اس طرح شکار کیا تھا جیسے کوئی بھیڑ اور بکرے کو جال میں پھانسے، بلکہ اسلام میں تو جانوروں کے ساتھ بھی شفقت کرنے کی ہدایت ہے، ان افریقی انسانوں کے ساتھ امریکہ میں جو کچھ ہوتا رہا اور اب تک ہے وہ ایک جانور سے زیادہ بدتر وجود کا برتاؤ ہے، کوئی گورا جس کالے کو چاہے اور جب چاہے اور جس طریقہ سے چاہے قتل کر سکتا ہے، ایک بوتل شراب کے لئے اس کو فروخت کر سکتا ہے، گھر روشن کرنے کے لئے اس کو باندھ کر کھڑا کر دیا جاتا اور اس کی کھوپڑی میں آگ لگا دی جاتی جس کی روشنی میں بیٹھ کر اہل ثروت ڈنر (Dinner) کھاتے، زہریلے کیڑوں، سانپ اور دوسرے جانوروں کا تجربہ ان کے جسم پر کیا جاتا، ابھی تھوڑے عرصہ پہلے کی بات ہے کہ دو افریقی آپس میں مل نہیں سکتے تھے اور زندگی کی ہر ضرورت کو کتوں اور بھیڑیوں کی طرح کھلے بندوں انجام دیتے تھے، کہاں ظلم و جہالت کا چڑھتا ہوا ظالمانہ مزاج اور کہاں اسلام کی بتائی ہوئی شریعت کہ اگر دو جانوروں کو ذبح کرنا ہو تو انہیں ایک ساتھ نہ باندھو اور ذبح کرنے سے پہلے پانی پلا دو، جانوروں کو رعیت کہا گیا، جن کے احساس کی رعایت، جن کے جسم کی رعایت، جن کی ضروریات کی رعایت داعی پر فرض ہے۔ سید صاحبؒ نے بہت اچھی مثالیں دے کر یورپ، افریقہ اور ایشیا کے مذاہب کی تصویر کشی کی ہے۔ اس کے بعد رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے پیغام انسانیت کا تعارف کرایا ہے۔

"عہد نبوی میں نظام حکومت" ایک عنوان سید صاحبؒ نے قائم کیا ہے اور چونکہ ان کی کتاب کا موضوع معاملات ہے اس لئے معاملات کو محدود نہیں بلکہ وسیع پیمانہ پر پھیلا دیا ہے۔ آپس میں ایک

فرد کا دوسرے فرد سے معاملہ، ایک گھر کے سرپرست کا معاملہ بیوی بچوں سے، ملازموں اور کارندوں سے یقیناً زیادہ قابل اہمیت ہے، لیکن اس سے بھی بڑھ کر قابل اہمیت معاملہ حکومت کا ہے، جو عوام کے ساتھ سامنے آتا ہے، جس میں پوری قوم جکڑی ہوئی ہوتی ہے، جیل خانے، پھانسی گھر اور سزا دینے والے جلاد ہر وقت موجود ہوتے ہیں، اگر یہ معاملہ جو سرکار اور رعیت کے درمیان ہے ٹھیک ہو جائے تو وہ معاملات جو خرید و فروخت، لین دین، محبت اور غم گساری کے سلسلہ میں برتے جاتے ہیں، وہ آسان سے آسان تر ہوتے جائیں گے، اس لئے سید صاحبؒ نے معاملات کا سرا وہاں سے ہاتھ میں لیا ہے جہاں سے ساری دنیا کے معاملات درست ہو سکتے ہیں یا بگڑ سکتے ہیں سید صاحبؒ نے صرف اسی پہلو پر غور نہیں کیا ہے بلکہ پبلک کا حکومت سے جو معاملہ ہونا چاہئے عوام کا تعلق قیادت سے، اس کو بھی شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے، اولوالامر کی اطاعت کے کیا حدود ہوں گے، یہ بھی قابل اہمیت موضوع ہے۔ سید صاحبؒ نے اس باب میں موضوع کی شخصی گفتگو کی ہے۔

سید صاحبؒ نے یہ دکھلایا ہے کہ اسلامی سلطنت کو اقامت عدل اور قیام امن میں جو دشواریاں پیش آئیں وہ دو طرفہ تھیں۔ ایک طرف وہ قوم تھی جو تہذیب و تمدن سے دور، آداب معاشرت سے بیگانہ اور وسیع میدانوں میں تنہا رہنے کی بنا پر اجتماعیت کے تمام لوازم اور آداب سے نابلد تھی۔ دوسری طرف متمدن قومیں تھیں، ایک رومی حکومت کی رعیت جو روم سے شام تک پھیلی ہوئی تھی، دوسری فارسی شہنشاہیت جو عراق کے اس سرحد تک جس کا سرا جزیرۃ العرب سے ملتا ہے، سید صاحبؒ نے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے اس وقت کی جغرافیائی ہیئت اور قوموں کے مزاج پر جو گفتگو کی ہے وہ اس درجہ سادہ اور شیریں انداز بیان میں ہے کہ معلوم نہیں ہوتا کہ ہم جغرافیا اور علم اجتماع پر گفتگو سن رہے ہیں، یا کوئی ادب پارہ ہے، اسی ضمن میں دکھایا

ہے کہ مدینہ منورہ کو دار الہجرۃ کیوں بنایا گیا ہے‘ جہاں کی ابتدا میں مہاجرین کے لئے آب و ہوا بھی ساز گار نہ تھی، تاہم آپؐ نے اس کی طرف ہجرت فرمائی، لیکن جب رفتہ رفتہ عرب کے اس حصہ میں بڑی حد تک نظام اسلام قائم ہوگیا اور صلح حدیبیہ نے عرب کے مرکز یعنی مکہ کا راستہ صاف کر دیا اور مکہ فتح ہوگیا، اس کے بعد عرب کے دوسرے حصوں کی طرف توجہ فرمائی۔ اس سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ دعوت اور مختلف قوموں کو اسلام کی طرف مائل کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا سید صاحبؒ نے اس کی تشریح فرمائی ہے اور اس کے بعد ایک ایسی عادلانہ سلطنت کی بنیاد ڈالی گئی جس کا قانون خدا کا قانون‘ جس کی حکومت خدا کی حکومت اور جس میں ہر شخص ایک طرح سے خود ہی اپنا حاکم اور خود ہی اپنا محکوم تھا کیونکہ اسلامی سلطنت بادشاہ اور اس کے خاندان کی ملکیت نہ تھی‘ بلکہ ملکیت تو صرف ایک خدا کی تھی لیکن اس کی نیابت سارے مسلمانوں کا یکساں حق تھی۔ یا اس کو یوں کہئے کہ نظام اسلام میں ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر رعایا کا نگراں و حاکم ہے شوہر اپنے اہل و عیال کا، بیوی شوہر کے گھر کی، معلم اپنے شاگردوں کا، آقا اپنے غلاموں کا غلام اپنے متعلقہ کاموں کا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک ”کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ“ یعنی تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے اور ہر شخص سے اس کے زیر نگرانی اشخاص (رعیت) کے متعلق سوال ہوگا۔ اس تحقیقی و علمی بیان سے اسلام کے اصول سلطنت کا ایک اساسی نقطۂ نظر سامنے آجاتا ہے[1]

یہ پورا باب حشو و زوائد سے پاک‘ علمی حقائق سے معمور‘ تاریخی اشارات سے پر‘، احادیث نبویہ کی مستند ترین روایات کا حامل ہے‘ مصنف نے دکھایا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معیار بالکل انوکھا تھا، جس میں ذرا بھی اور دور کا بھی شائبہ سلاطین عصر یا اس وقت کے نوابین کا

[1] سیرۃ النبی جلد ہفتم ص ۶۹

نہیں تھا، نشست و برخاست سے لے کر بستر و مسند‘ گدے اور کرسی‘ لباس اور زیور‘ دربان اور پہرے دار تک کہیں سے بھی دور کی جھلک بھی ایسی سلطنت کے مالک میں نظر نہیں آتی، اس سلسلہ میں سید صاحبؒ نے سیرت سے جو واقعات نقل کر کے جمع کر دئے ہیں وہ سیرت پاک کی ایسی جھلکیاں ہیں جن کو جمع کر کے ایک مستقل کتاب تیار ہو سکتی ہے اور اگر اس کا ترجمہ دوسری زبانوں میں کیا جائے تو اسلام کے لئے حجت ہوں اور ہمارے واعظ اور سیرت نبویؐ پر تقریر کرنے والے اگر اس کا مطالعہ جاری رکھیں تو عام مسلمانوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و ہیبت پیدا کرنے اور آپؐ کی ذات گرامی سے محبت و عقیدت بڑھانے کا بہترین وسیلہ ہاتھ آجائے گا، چند صفحے اصل کتاب کے پڑھئے:

”ایک بار آپؐ صحابہ کو مال تقسیم فرما رہے تھے، ایک آدمی آیا اور حرص کے مارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر ٹوٹ پڑا، آپؐ کے ہاتھ میں کھجور کی چھڑی تھی، آپؐ نے اس سے کونچ دیا جس کی وجہ سے اس کے چہرے پر زخم آگیا، آپؐ نے دیکھا تو اسی وقت فرمایا کہ آؤ مجھ سے قصاص لو، لیکن اس نے کہا کہ یا رسول اللہ میں نے معاف کر دیا[1]

ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بہت سی لونڈیاں آئیں، حضرت فاطمہؓ کے ہاتھوں میں چکی پیستے پیستے چھالے پڑ گئے تھے انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ہاتھ دکھائے اور فرمایا کہ گھر کے کام کاج کے لئے ان میں سے ایک لونڈی عنایت فرمائیے، لیکن آپؐ نے فرمایا کہ بدر کے یتیم تم سے زیادہ اس کے مستحق ہیں۔ ابطال سود کا جب حکم آیا تو سب سے پہلے آپؐ نے اپنے چچا حضرت عباسؓ کے تمام سودی معاملات کو باطل قرار دیا۔ جاہلیت کے انتقام کے مٹانے کا جب قانونِ عام نافذ ہوا تو سب سے اول اپنے ہی خاندان کا انتقام جو دوسرے قبیلہ پر باقی چلا آرہا تھا معاف فرمایا۔ اسلامی محاصل زکوٰۃ و صدقات و عشر وغیرہ کے مستوجب ہونے اور ان کی ادائیگی میں خاندانِ

[1] سیرۃ النبی ج، ص ۵۷۔

نبوت بھی بالکل عام مسلمانوں کی طرح شریک تھا۔[۱]

اس طرح کی چودہ روایتیں سید صاحبؒ نے اس تسلسل کے ساتھ صحاح کی روایات سے اخذ کرکے نقل کردی ہیں جن سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ان لوگوں کے لئے جن کو حکومت و وجاہت ملی ہے ظاہر ہوتا ہے اور انسانیت کی تاریخ کے کسی گوشہ میں اس کی مثال نہیں ملتی، حکومت و امارت کا حصول احکام الٰہی کو نافذ کرنے اور ضرررساں انسانیت سوز حرکتوں سے باز رکھنے کے لئے تھا، شخصی یا خاندانی کسی طرح کی وجاہت یا ثروت اور جاہ و حشم کا شائبہ نہیں ملتا، ان معاملات کی پابندی جو حکومت اور رعیت کے درمیان میں مطلوب ہے اس کی پوری تصویر ان اوراق میں سامنے آجاتی ہے اور پوری کتاب اس طرح سیرت نبویؐ سے قریب کرنے اور اس کی محبت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے، اسی طرح حلم وعفو، وسعت قلبی، دوسروں کی مجبوریوں کو سمجھنا اور بشری کمزوریوں کو ناقابل معافی قرار دینا آپ کی سیرت کا خاصہ تھا۔ سید صاحبؒ نے اس جامعیت اور توسع کے ساتھ اس کو واضح کیا ہے کہ ایک طرف جرائم کی سزا اور حقوق العباد پر دار و گیر میں کسی طرح کی لچک نہ پائی جائے اور قانون سب کے لئے عام ہو، ایک ہی معیار سب کے لئے ہو اور دوسری طرف رحم دلی، شفقت اور قلبی رقت بھی اس درجہ کی نظر آتی ہے جو واقعی انسانیت کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے، عہد نبوت میں جو متمدن سلطنتیں تھیں ان کی مثالیں دے کر مصنف نے دکھلایا ہے کہ کوئی عام انسان یا رعیت خواب میں بھی یہ تصور نہیں کرسکتا تھا کہ حاکم وقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مناظرانہ انداز میں بات کرسکے، یا اپنے حقوق کا مطالبہ کرسکے، جب کہ سیرت نبویؐ سے سید صاحبؒ نے ایسے متعدد واقعات نقل فرمائے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرانہ جاہ و جلال تو بے شک اللہ کا عطا کردہ آپ کے اندر موجود تھا، لیکن "حاکمانہ شان" اور جبروتی آن بان کا وجود گرامی میں

۱؎ سیرۃ النبی جلد ہفتم ص ۷۶۔

کوئی شائبہ نہیں تھا اور حق دار کا حق دلانے میں کوئی جذبہ سوائے خوف خدا کے حائل نہیں ہوا۔

سیرت نبویؐ کا یہ حصہ جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کی عملی مثالیں ہیں ان کی ایک خصوصیت تو وہ ہے جو علامہ شبلی نعمانیؒ کے قائم کردہ معیار کا نمونہ ہے جس میں افسانوی رنگ کی کوئی گنجائش نہیں، احادیث اور احادیث میں بھی صحیح تر اور ثابت شدہ واقعات پیش کئے جاتے ہیں۔ زبان میں شیرینی اور انداز بیان میں گداز اور ایسا طرز بیان جس کو پڑھ کر یا سن کر سخت سے سخت معاند کا دل بھی پسیج جائے۔ اس کو مختصراً یوں کہئے، صحت بیان اور زور بیان و اقفیت اور محبت کا ایسا حسین امتزاج جس کا نمونہ کسی زبان میں حتی کہ عربی میں بھی نہیں ملتا۔

اسلام کے نظریۂ حکومت، طرز حکومت اور مقاصد حکومت کے اس سے بہتر عملی نمونوں کی تصویر کہیں بھی یکجا نہیں ملتی۔ سیرۃ النبی جلد ہفتم جس کا موضوع معاملات ہے، اس میں "معاملہ" کی موضوعی حیثیت، افراد کے درمیان معاملات کی نوعیت، افراد کا حکومت سے اور حکومت کا افراد سے کیسا تعلق ہو، سیرت کا ایک اہم باب ہے جس کو سیرت کی اس جلد میں سمیٹنے کا کام شروع کیا گیا تھا، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی ماہر اور تجربہ کار انجینیر نے ایک لق و دق عظیم المرتبت قصر شاہی کا نقشہ بنایا تھا جس کا صرف ایک صدر دروازہ تیار ہوچکا کہ انجینیر پورے خاکے کے ساتھ رخصت ہوگیا مگر جو صدر دروازہ بنایا تھا اس کی مثال بھی تاریخ میں نہیں ملتی۔

امیر خسرو بحیثیت فارسی رباعی نگار

از

جناب سید وحید اشرف صاحب کچھوچھوی*

میری نظر سے امیر خسرو کی تقریباً سوا سو رباعیاں گزری ہیں۔ یہ ان کے بعض دیوانوں کے ساتھ مخطوطہ کی شکل میں محفوظ ہیں۔ میں نے جو خطی نسخے دیکھے ہیں وہ مدراس کے گورنمنٹ اورینٹل کتبخانۂ مخطوطات میں محفوظ ہیں۔ ان میں کہیں کہیں کاتب سے سہواً یا عمداً غلطی بھی ہوگئی ہے۔ کچھ رباعیاں کاغذ کے کرم خوردہ ہونے کے سبب ناخوانا بھی ہیں۔ ان ناخوانا رباعیوں کو نہ کسی اعتبار سے غلط کہا جاسکتا ہے اور نہ بعض مشکوک الفاظ کو صحت کے ساتھ متعین کہا جاسکتا ہے۔ صحت متن کے لئے متعدد نسخوں کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ اس لئے ہماری بحث سے وہ رباعیاں خارج ہیں جن کی قرأت میں ابھی شبہ ہے یا جو مذکورہ قلمی نسخوں میں ناخوانا ہیں۔

ہماری نظر سے خسرو کی جو رباعیاں گزری ہیں ان میں تقریباً چالیس رباعیاں شاعر کے فلسفۂ اخلاق پر مشتمل ہیں۔ ان میں سے بعض اخلاقی امور کے بارے میں خسرو کے نقطۂ نظر کو واضح طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔ تقریباً ۴۵ رباعیاں عشقیہ ہیں۔ باقی رباعیوں کے موضوعات شراب نوروز،

---

* عائشہ کمپلکس، بیرون پانی گیٹ، ۱۷-کلیان سو سائٹی۔ بڑودہ - ۳۹۰۰۱۹۔

مدح و ذم اور بعض رباعیوں میں کچھ تاریخی اشارے ملتے ہیں۔ چند رباعیاں ایسی ہیں جو نہایت رکیک اور غیر اخلاقی ہیں۔ یقین نہیں آتا کہ انہیں خسرو نے لکھا ہوگا۔ بعض رباعیوں سے گمان ہوتا ہے کہ ان میں کسی کی طرف طنز و تشنیع سے کام لیا گیا ہے۔ شبہ ہوتا ہے کہ کچھ گندے کلام لکھ کر خسرو کی طرف اس لئے منسوب کر دیئے گئے ہوں کہ ان کی نیک نامی میں بٹہ لگ جائے۔ ہم نے ان رباعیوں کو فی الحال نظر انداز کر دیا ہے۔ یہاں ہم ایک ایسی رباعی لکھتے ہیں جو یقیناً کسی کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ مخاطب کون ہو سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ وہی ہو سکتا ہے جس کو خسرو کی مقبولیت ناپسند رہی ہو۔ رباعی یہ ہے:

می طعنہ زنی مرا کہ چون آمدہ ای	بی اسپ و سلاحے و زبون آمدہ ای
شک نیست تو از کسِ فراخ مادر	با طبل و علم زدہ برون آمدہ ای

تقریباً سوا سو رباعیوں میں سے کوئی نوّے رباعیوں کے صرف دو بڑے موضوعات ہیں۔ ایک حسن و عشق اور دوسرے فلسفۂ اخلاق۔ اس لئے یہی دو موضوعات خسرو کی رباعی میں خصوصی طور پر قابل توجہ ہیں اور انہیں سے وابستہ رباعیوں کی بنیاد پر خسرو کی رباعی گوئی کا جائزہ لیا جانا مناسب ہے اور انہیں کے معیار پر خسرو کی رباعی کے معیار کا تعین ہوگا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ باقی رباعیاں ناقابل اعتنا ہیں۔ تاریخی قسم کی رباعیاں اگرچہ چند ہیں لیکن ان سے بعض تاریخی استشہاد کئے جاسکتے ہیں۔ نوروز اور شراب پر ان کی رباعیاں محض تفنن طبع کے طور پر معلوم ہوتی ہیں۔ اخلاقی رباعیوں میں شراب کو انہوں نے واضح طور پر شراب معرفت کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ بعض رباعیاں مدحیہ ہیں اور ان رباعیوں میں انہوں نے خاصا زور پیدا کیا ہے۔ لیکن رباعی میں خسرو کے زیادہ ممدوح نظر نہیں آتے۔ ایک غازی ملک ہیں اور دوسرے ان کے روحانی مرشد۔

اب تک خسرو کی شاعری اور شخصیت کے مطالعہ میں ان کی رباعیوں کو پیش نظر نہیں رکھا گیا ہے۔ حالانکہ رباعی ایک ایسی صنفِ سخن ہے جس میں زندگی کے مختلف پہلوؤں پر شاعر کے نظریہ کا واضح

طور پر اظہار ملتا ہے۔ رباعی بالعموم غزل کی ایمائیت اور پردہ داری کی متحمل نہیں ہوتی۔ قوت تاثیر کے ساتھ روشن بیانی رباعی کا خاص وصف ہے۔ اس لئے رباعی کے ذریعہ شاعر کو زیادہ درستی کے ساتھ سمجھا جاسکتا ہے۔ خسرو نے مثنوی، غزل اور قصیدے کی شکل میں کثرت سے اشعار لکھے ہیں جو ان کی شخصیت کے آئینہ دار ہیں اور ان کو چھان پھٹک کر ایسے اشعار بڑی تعداد میں پیش کئے جاسکتے ہیں جن سے خسرو کے نظریہ زندگی پر روشنی پڑتی ہے لیکن رباعی شاعر کی فکر کا نچوڑ ہوتی ہے اور ہر رباعی اس کے کسی زاویۂ نظر کی حامل۔ اس لئے یہاں زیادہ چھاننے پھٹکنے کی ضرورت نہیں ہر چند خسرو فلسفۂ اخلاق کے شاعر نہیں اور فلسفیانہ مزاج بھی نہیں رکھتے، وہ تو صرف بندۂ عشق ہیں لیکن رباعی فن ہی ایسا ہے کہ شاعر کسی نہ کسی طرح اپنے فکری رجحان اور زندگی کے بارے میں مختلف زاویہ ہائے نظر کو رباعی کا موضوع بنا لیتا ہے۔ عام طور سے خسرو کی یہ اخلاقی رباعیاں ان کی شاعرانہ عظمت کا کامل مظہر نہیں ہیں اور اس طرح کی صرف چند رباعیوں میں ان کا جمالیاتی ذوق پوری طرح ابھرکا ہے، تاہم زندگی کے بارے میں ان کے نظریات سمجھنے کے لئے ان رباعیوں کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ایسا بھی نہیں کہ فنی اعتبار سے یہ رباعیاں اتنی کمزور ہوں کہ انہیں قابل اعتنا ہی قرار نہ دیا جائے۔ رباعی میں خسرو کے فن کا بھرپور اظہار عشقیہ موضوعات پر دیدنی ہے۔ یہاں پہلے ہم چند ایسی رباعیاں پیش کرتے ہیں جن سے خسرو کے بعض نظریات کا اظہار ہوتا ہے۔

دیکھئے خسرو جو سراپا بندۂ عشق ہیں عقل کے بارے میں کیا کہتے ہیں:

تا عقل تو بر نفس مقدم نشود   اسلام تو پیش ما مسلم نشود
دندان طمع کہ باد حرص است درد   تا بر نکنی درد سرت کم نشود

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خسرو ایمان تقلیدی کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ علم کے ذریعہ سے عقل کو مطمئن کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کے بعد ہی عشق کا کام شروع ہوتا ہے۔ دوسرے مصرع

میں ایک دوسری بات کہی ہے کہ انسان کی مصیبتوں کی اصل اس کی حرص ہے۔ لیکن چاروں مصرعوں میں ربط موجود ہے۔ حرص و طمع کا تعلق نفس سے ہے اور آدمی حریص اس لئے ہوتا ہے کہ اس کی عقل نفس سے مغلوب ہوجاتی ہے۔ اس لئے شاعر کے نزدیک حریص آدمی کا اسلام مسلم نہیں۔

خسرو کا تعلق ہمیشہ شاہی درباروں سے رہا ہے اور اگرچہ وہ حرص و طمع سے دور تھے لیکن درباروں ہی سے ان کی روزی وابستہ تھی۔ خسرو اس روزی سے مطمئن نہیں نظر آتے۔

خوار است کسیکہ علم و حکمت دارد   جاہل ہمہ روز ناز و نعمت دارد
لیکن چہ کنم کہ جہل در عالم حد   پیوستہ علاقہ ای بحشمت دارد

(عالم، حکمت والا خوار ہے اور جاہل ناز و نعمت کی زندگی بسر کرتا ہے لیکن کیا کروں کہ اس دنیا میں نعمت و حشمت جہالت ہی کا حصہ ہے)۔ چنانچہ وہ اپنی دلی کیفیت کا اظہار اسطرح کرتے ہیں۔

ہر چند کہ از غصہ دلم باید ریش   وز دست سپہر دون خورم ہر دم نیش
روزی نشود مرا کہ روزی طلبم   از غیر خداوند جہان روزی خویش

(ہر چند کہ غم سے میرا دل زخمی ہوجائے اور آسمان مجھے ڈنک مارتا ہی رہے لیکن مجھے روزی نہ کرے کہ میں خدائے تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے سے روزی طلب کروں)

انسان کے کام آنے والی چیز صرف تقویٰ ہے۔

تا چند ترا حرص و طمع خواہد بود   بر لوح دلت نقش جزع خواہد بود
بگذر ز سر جزع کہ در آخر کار   نفع تو ز تقویٰ و ورع خواہد بود

(کب تک تم حرص و طمع میں مبتلا رہوگے اور کب تک تمہارے لوح دل پر شکوہ و شکایت نقش رہے گی۔ دوسروں کا گلہ و شکوہ چھوڑو کیونکہ آخر کار تقویٰ ہی سے فائدہ پہنچے گا)

خسرو بھی خواجہ حافظ شیرازی کے اس اصول پر کاربند ہیں کہ:

رضا بدادہ بدہ وز جبین گرہ بکشائے — کہ بر من و تو در اختیار نکشاد ست

خسرو کہتے ہیں :

ہر چند کہ از قضا بلا می آید — وز قوس فلک تیر جفا می آید
در کنج جفا نشستہ و منتظرم — تا بار دگر چہ از خدا می آید

(ہر چند کہ تقدیر الٰہی سے بلا آتی ہے اور آسمان کے کمان سے جفا کا تیر آتا ہے۔ میں جفا کے کنج میں بیٹھا منتظر ہوں کہ دیکھوں اب حکم الٰہی سے کیا آتا ہے)

دنیا کی بے وفائی کا ذکر اکثر شعراء نے کیا ہے۔ خسرو بھی کہتے ہیں :

ز خلق جہان وفا مجوئید کہ نیست — وز اہل زمان صفا مجوئید کہ نیست
سر چشمۂ فیضہا خدا باشد و بس — از غیر خدا وفا مجوئید کہ نیست

ممکن ہے کہ چوتھا مصرعہ یوں رہا ہو ع از غیر خدا خدا مجوئید کہ نیست۔ یعنی خدا کو خدا ہی سے طلب کرو۔ غیر خدا سے نہ طلب کرو۔ لیکن ہمارے پیش نظر مخطوطہ میں "وفا" ہی ہے۔

دوست کے لئے جان بھی فدا کرنے سے دریغ نہ کرنا چاہئے :

گر دم زدہ ای ز مہر یاران عزیز — باید کہ کنی فدائے ایشان ہر چیز
ہر چند کہ جان عزیز باشد اے دل — چون یار طلب کند فدا کن آن چیز

(اگر تمہیں اپنے عزیز دوستوں سے محبت کا دعویٰ ہے تو اپنی ہر چیز ان کے لئے فدا کر دو۔ ہر چند کہ جان بہت عزیز ہے لیکن اگر دوست طلب کرے تو اسے بھی فدا کر دو)

ایک رباعی میں خسرو نے اپنے حقیقتِ حال کا اظہار اس طرح کیا ہے :

ہر چند کہ ما مقید آب و گلیم — در دیدۂ اہلِ معرفت جان و دلیم
یک گام ز راہ شرع بیرون ننہیم — در ہر چہ کسی گمان برد معتدلیم

(ہر چند کہ ہم آب و گل میں مقید ہیں لیکن اہل معرفت کی نگاہوں میں ہم جان و دل ہیں۔ راہِ شرع سے ہم ایک قدم بھی باہر نہیں نکالتے۔ ہمارے متعلق کوئی کچھ بھی گمان کرے ہم راہِ اعتدال پر ہیں)

خسرو کہتے ہیں کہ آدمی کو جائز تدبیر پر عمل کرنا چاہئے اور جو نتیجہ ہاتھ آئے تو اسے تقدیر سمجھ کر بخوشی قبول کرنا چاہئے۔ بغیر عمل و تدبیر کے زندگی ایک کمزور بڑھیا کے مانند ہے۔

مرد است کہ مستعد تقدیر شود — وز بہر شدن خجستہ تدبیر شود
زین سان کہ تو پیر میشوی اے خواجہ — روزے صد بار پنبہ زن پیر شود

(مرد وہ ہے جو خوشی سے تقدیر کو قبول کر لے اور اس تقدیر کے لئے اچھی تدبیر کرے۔ اے خواجہ تم اس طرح بے عمل رہ کر بوڑھے ہو رہے ہو۔ اس طرح تو ایک کھوسٹ بڑھیا روزانہ ایک سو بار بوڑھی ہوتی ہے۔ یعنی سخت ضعیفی میں ہر لمحہ ضعف بڑھتا ہی جاتا ہے۔)

خسرو کے فن کا کمال ان کی عشقیہ رباعیوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ خسرو کا دل وارفتۂ حسن اور گداختۂ عشق ہے۔ ان کی یہ کیفیت ان کی غزلوں سے ظاہر ہے۔ ان کی ہر غزل سینائے جلوۂ حسن خوباں اور مینائے مے چشم محبوباں کی مثال ہے۔ ان کی رباعیوں میں بھی یہ جلوہ گری قابلِ دید ہے۔ خسرو کی غزل میں جو روانی ہے، جذبہ کا جو مسلسل بہاؤ ہے اور احساسات کا ایک سلسلہ وار موج در موج دھارا ہے وہ رباعی میں ممکن نہیں۔ یہاں تو حُسن کی صرف ایک کیفیت، عشق کا صرف ایک رمز یا دونوں کے بارے میں کسی ایک نکتہ ہی کا اظہار بالعموم نظر آتا ہے۔ یہاں جذبات کا تموج درکار نہیں۔ خسرو کے لئے اس میدان میں کامیاب ہونا بظاہر آسان نہیں معلوم ہوتا لیکن اس موضوع پر رباعی میں نہ صرف وہ کامیاب ہیں بلکہ کم از کم وہ ہندوستان میں فارسی شعراء میں اپنا ہم پلہ نہیں رکھتے۔ یہی نہیں خسرو کا موازنہ ایرانی فارسی شعراء سے بلا جھجک کیا جا سکتا ہے۔ خیام کا موضوع شراب، بے ثباتی دنیا اور طلب مغفرت ہے۔ ابو سعید ابو الخیر، سرمد،

بابا افضل کاشی کا خاص موضوع تصوف و اخلاق ہے۔ ان لوگوں نے اپنے اپنے موضوع پر فارسی کی بہترین رباعیاں پیش کی ہیں۔ اسی طرح امیر خسرو نے حسن و عشق کے موضوعات پر رباعی کا بہترین سرمایہ چھوڑا ہے تو یہ ان کا طرۂ امتیاز قرار دیا جا سکتا ہے۔ خسرو کی یہ رباعیاں تعداد کے اعتبار سے کم ہیں لیکن اسے کیا کیجئے کہ بڑے بڑے اساتذہ کے دیوان میں رباعیوں کی تعداد کم و بیش اتنی ہی ہے جتنی کہ خسرو کی رباعیاں ہیں۔ اندازہ ہے کہ خسرو نے فارسی میں پونے دو سو رباعیاں لکھی ہوں گی۔ سعدی نے تقریباً دو سو رباعیاں لکھی ہیں اور حافظ نے ایک سو سے بھی کم لکھی ہیں۔ جن رباعیات کی بنا پر شعراء کی شہرت بحیثیت رباعی گو شاعر کے ہوئی ہے ان کی تعداد کسی بھی شاعر کے وہاں ایک سو سے زیادہ نہ ہوگی۔ شاید فارسی میں سب سے زیادہ رباعیاں دو شاعروں نے لکھی ہیں۔ ایران میں سحابی استرآبادی اور ہندوستان میں خواجہ میر درد۔ لیکن فی الحال ان دونوں کے بارے میں ہمارے لئے کوئی رائے دینا مشکل ہے۔ سعدی یقیناً رباعی میں بھی بلند مقام رکھتے ہیں اور اگرچہ خسرو پر ان کو ترجیح حاصل ہے لیکن خسرو نے بھی اس صنف میں داد سخن دی ہے اور خسرو کی بہترین رباعیاں اس بات کا کافی ثبوت ہیں کہ وہ اس فن میں بھی قاصر نہیں ہیں۔

خسرو کی عشقیہ رباعیوں کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے ہم یہاں ان کی کچھ رباعیاں پیش کرتے ہیں تاکہ ہمارے کچھ کہنے سے پہلے یہ رباعیاں خود اپنی کیفیت بتا سکیں۔

بر خوبیِ خود ناز نشاید کردن   ور نیز کنی نکو نباید کردن
حسن آب روان ست کہ بر میگذرد   بر آب روان تکیہ نباید کردن

(اپنے حسن پر ناز نہیں کرنا چاہئے اور اگر پھر بھی تم ناز کرو تو یہ زیب نہیں دیتا۔ حسن بہتا ہوا پانی ہے جو گزر جاتا ہے۔ بہتے ہوئے پانی پر تکیہ نہیں کرنا چاہئے ورنہ ظاہر ہے کہ وہ تمہیں بہالے جائے گا اور غرق کردے گا)

مخطوطہ میں تینوں مصرعوں میں "قافیہ نباید" ہے۔ اس طرح رباعی میں قافیہ غائب ہو جاتا ہے۔

اور صرف ردیف "نباید کردن" رہ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے مصرعہ میں "نکو نباید کردن" بے معنی ہے۔ ہم نے تصحیح قیاسی سے کام لے کر قافیہ کا استعمال کیا ہے۔

هر روز بغمزه قصد جانم چکنی   سرگشته و رسوائے جهانم چکنی
یکشب اگرت مست بیابم تنها   دانم چکنم اگر ندانم چکنی

(تم ہر روز غمزہ سے میری جان کا قصد کیوں کرتے ہو۔ مجھے سرگشتہ اور رسوا کیوں کرتے ہو۔ اگر ایک شب تم کو میں تنہا مست پاؤں تو مجھے پتہ ہے کہ میں کیا کروں گا اور مجھے نہ معلوم ہو کہ میں کیا کروں تو تم کیا کروگے)

مشکیں خط تو کز بوئے خون آید ازو   دل خون شود آنگاه زبوی آید ازو
خونم خواری و گر لبت را بگزم   نے خون تو خون من برون آید ازو

(تمہاری مشکیں زلفوں سے خون کی بو آتی ہے۔ دل زلفوں میں خون کر کے کس طرح زبوں رکھتے ہو۔ تم نے میرا خون پیا ہے۔ اگر میں تمہارا ہونٹ کاٹوں تو اس میں تمہارا نہیں میرا خون نکلے گا)

مه را سر ابروے تو دیدن ندهم   شب را خم گیسوئے تو دیدن ندهم
آنکس کہ بدید روئیت از جان ندهد   جانا سر تو روی تو دیدن ندهم

(چاند کو میں تیرے ابرو کو دیکھنے نہ دوں گا۔ شب کو میں تیرے گیسو کا خم دیکھنے نہ دوں گا۔ جو شخص تیرے چہرے کو دیکھ کر جان نہ دے دے تو اسے جاں تیرے سر کی قسم اسے میں تیرا چہرہ دیکھنے نہ دوں گا)

خوبان گم گشتند سر انگندهٔ تو   و آزاد دلان بجان و دل بندهٔ تو
چون خنده زنی شکر غلام تو شود   من بندهٔ غلام آن شکر خندهٔ تو

(تمام حسینوں کا سر تیرے آگے خم ہے۔ تمام عاشقان جان و دل سے تیرے غلام ہیں۔ تیری خندہ زنی کے وقت شکر تیرا غلام ہو جاتی ہے۔ میں بندہ تیرے اس شکر خندہ کا غلام ہوں)

بتوان لبت از خونِ مسلمان شستن
ہرگز نتوان مہر تو از جان شستن
یارے چو ترا ز دست نتوان دادن
از آب حیات دست نتوان شستن

(یہ ہو سکتا ہے کہ تو اپنے ہونٹوں کو مسلمان کے خون سے دھوئے، پھر بھی تیری محبت دل سے نہیں نکالی جا سکتی۔ تجھ جیسے دوست کو پا کر کوئی ہاتھ سے نہیں جانے دے گا۔ آب حیات کو پا کر کوئی اسے ہاتھ سے نہیں جانے دے گا۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ آب حیات ایسی چیز نہیں جس سے ہاتھ دھو کر اس کو ضایع کر دیا جائے۔ آب حیات سے جان کی پرورش ہوتی ہے۔)

ہنگام خزان کہ یاسمین میریزد
ابر از مژہ لولوی ثمین میریزد
ہر سرخ گلے کہ می بریزد از شاخ
خونیست کہ باد بر زمین میریزد

(خزاں کے موسم میں جب کہ یاسمین کے پھول جھڑتے ہیں۔ بادل اپنی پلکوں سے قیمتی موتی برساتا ہے۔ اس وقت ہر سرخ پھول جو شاخ سے گرتا ہے وہ خون ہے جسے ہوا زمین پر گراتی ہے)

جانا ز فراق تو غمیم نہ ز تو
وز جور و جفائے تو چنینم نہ ز تو
ما را ہمہ از چشم دوئی می بینی
وان از کژی چشم تو بینم نہ ز تو

(اے محبوب میں ترے فراق کی وجہ سے غمگین ہوں۔ تیری وجہ سے نہیں۔ میں تیرے جور و جفا سے ایسا ہوں۔ تیری وجہ سے نہیں۔ تو مجھے دوئی کی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ میں اسے تیری آنکھ کی کجی کے سبب سمجھتا ہوں۔ تیری وجہ سے نہیں۔)

دل بے رخِ تو بعجز شیرین نکنم
جز خاک سر کوئے تو بالین نکنم

گفتی کہ تو بہر من فدا کن جان را
اے جان بفدایت، چکنم کین نکنم

(تیرے چہرے کے دیدار کے بغیر میرا دل خوش نہیں ہوتا۔ تیرے کوچے کی خاک ہی میری بالین ہے۔ تو نے کہا "میرے لئے جان فدا کر دو" میری جان تجھ پر فدا ہے۔ اگر میں جان فدا نہ کروں تو اور کر ہی کیا سکتا ہوں۔ یہ جان اسی لئے تو ہے۔")

روزی کہ در آید چو تو خورشید وشی
در خانۂ من بندہ خرامندہ خوشی
برخیزم و دیدہ را بہ پیش تو کشم
چون نیست مرا بہتر ازین پیشکشی

(ایک دن خراماں تو جو خورشید کی مانند ہے میرے گھر آجائے تو میں اٹھ کر تیرے سامنے اپنی آنکھیں نکال کر رکھ دوں کیونکہ اس سے بہتر اور کوئی پیش کش میرے پاس نہیں ہے۔)

جانا چو رخِ تو مہ ندارد روے
مثل تو ندیدم بجہان دلجوے
گر با دل من زلفِ تو کژ ہست چہ باک
اندر سر تو کژی نباید موے

(اے محبوب تیرے چہرے کی طرح چاند کا چہرہ نہیں ہے۔ تجھ جیسا دل جو میں نے دنیا میں نہیں دیکھا۔ اگر میرے دل کے ساتھ تیری زلف کج ہے تو پروا نہیں۔ تیرے سر میں بال برابر کجی نہ ہونا چاہیے)

خسرو کی جو عشقیہ رباعیاں یہاں پیش کی گئی ہیں ان میں والہانہ انداز بیان دیدنی ہے۔ ہر مصرع چست اور رواں ہے۔ چوتھے مصرعہ کی جامعیت رباعی کو پختہ تر بناتی ہے اور اکثر اس کی معنویت کو وسیع تر کر دیتی ہے اور یہ مصرع صرف وقتی طور پر رباعی کا جزو ہی بن کر نہیں رہ جاتا بلکہ اس کو زندگی کے مختلف احوال و کوائف کے ساتھ تطبیق دے سکتے ہیں۔ مثلاً یہ مصرع:

از آب حیات دست نتوان شستن

ہشیار کہ راہ یار پیچ است و دراز

برآب روان تکیہ نباید کردن

اندر سر تو کثری نباید موئے

مصرعوں کی لچک اور معنویت میں وسعت ایک خاص خوبی ہے جو شعریت کی بھی خاص ہے اس لئے خسرو کی عشقیہ رباعیاں ان کے فنی شعور کی مظہر ہیں۔

خسرو اور سعدی کی رباعیوں میں ایسی رباعیاں مل جاتی ہیں جن میں ایک ہی خیال کو دونوں نے مختلف طریقوں سے پیش کیا ہے۔ یہاں دونوں کی ایسی چند رباعیوں پر نظر ڈالنا خسرو کے فن کو نمایاں کرنے میں مفید ہوگا۔ ذیل میں ایسی چند رباعیاں پیش کی جاتی ہیں۔

ایک رباعی کا مضمون عنصری، سعدی اور حافظ تینوں کی رباعیوں میں ملتا ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ خسرو کے پیش نظر عنصری اور سعدی کی رباعیاں بھی تھیں یا نہ تھیں لیکن انہوں نے دونوں سے الگ طرز اختیار کرکے مضمون کو جالب تر بنا دیا ہے۔ پہلے یہاں ہم تین مذکورہ شعراء کی رباعیاں پیش کرتے ہیں:

عنصری:-

در عشق تو کس پائے ندارد جز من　　در شورہ کسے تخم نکارد جز من

با دشمن و با دوست بدت میگویم　　تا ہیچ کست دوست ندارد جز من

سعدی:-

آن دوست کہ آرام دل ما باشد　　گویند کہ زشت است، "بہل" تا باشد

شاید کہ بچشم کس نہ زیبا باشد　　تا یاری از آن من تنہا باشد

حافظ:-

اے دوست ترا دوست کہ دارد جز من　　یا خوئے بدت پائے کہ دارد جز من

ہر جا کہ روم خوئے بدت خواہم گفت　　تا ہیچ کست دوست ندارد جز من

عنصری محبوب کو مخاطب کرکے کہتا ہے کہ تجھ سے میرے سوا کوئی عشق کرہی نہیں سکتا۔ کیونکہ تجھ سے عشق کرنا شورہ زمین میں تخم ریزی کرنا ہے اور یہ میرا کام ہے۔ پھر دوسرے دو مصرعوں میں کہتا ہے کہ میں دوست اور دشمن سے تیری برائی بیان کروں گا تاکہ میرے سوا تجھے کوئی دوست نہ رکھے۔ مگر ان دونوں اقوال میں ربط نہیں قائم رہتا کیونکہ جب اس کے محبوب سے کوئی دوسرا محبت کرہی نہیں سکتا تو پھر اس کی برائی دوسروں سے بیان کرنے کی حاجت نہیں رہ جاتی۔

سعدی نے اپنی رباعی میں اس بے ربطی کے نقص کو دور کردیا ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ محبوب جو میرے دل کا آرام ہے، دوسرے اسے برا کہتے ہیں۔ پھر دوسرے دو مصرعوں میں کہتے ہیں کہ یہ اچھا ہے تاکہ "یاری" تنہا میری ملکیت رہے اور اس میں کوئی شریک نہ ہوسکے۔

حافظ نے اسی خیال کو زیادہ استادی کے ساتھ استعمال کیا ہے اور مضمون کو بلند کردیا ہے۔

اے دوست ترا دوست کہ دارد جز من　　یا خوئے بدت پائے کہ دارد جز من

ہر جا کہ روم خوئے بدت خواہم گفت　　تا ہیچ کست دوست ندارد جز من

یہاں سعدی اور حافظ کے بیان میں ایک فرق ہے۔ سعدی کہتے ہیں کہ اس کے محبوب کو لوگ برا کہتے ہیں۔ برا کہنے کے لئے بھی تعلق کا ہونا ضروری ہے یعنی اس کے محبوب کے یار اور لوگ بھی ہیں۔ یا ہوچکے ہیں اس لئے ان کے اس کے خوئے بد کا تجربہ ہو چکا ہے۔ حافظ نے اپنے محبوب کو پوشیدہ رکھا ہے اور کہتے ہیں کہ جہاں کہیں میں جاؤں گا اس کو برا مشہور کردوں گا تاکہ اس کی محبت کا خیال کسی اور کو نہ ہوسکے۔ حافظ نے محبوبیت کے رمز کا خیال رکھا ہے اور بیان میں احتیاط سے کام لیا ہے۔

خسرو نے اس موضوع پر جو رباعی لکھی ہے اس کی فضا ان تینوں رباعیوں سے الگ ہے جس سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ خسرو نے یہ مضمون کسی دوسرے سے لیا ہے۔ خسرو نے اپنی رباعی کی فضا میں

جو دل کشی پیدا کی ہے وہ منفرد ہے۔ رباعی یہ ہے ؛

مرا سر ا بروئے تو دیدن ندہم   شب را خم گیسوئے تو دیدن ندہم

آنکس بدید روئیت از جان ندہد   جانا سر تو، روی تو دیدن ندہم

ایک دوسری رباعی میں سعدی کہتے ہیں :

یک روز باتفاق صحرا من و تو   از شہر برون شویم تنہا من و تو

دانی کہ من و تو کی بہم خوش باشیم   آن وقت کہ کس نباشد الا من و تو

خسرو کہتے ہیں :۔

ہر روز بغمزہ قصد جانم چکنی   سرگشتہ در سوائے جہانم چکنی

یکشب اگرت مست بیابم تنہا   دانم چکنم وگر ندانم چکنی

سعدی کی رباعی میں ایک نکتہ ہے اور اس کا فصیح اور شیریں اظہار۔ لیکن خسرو کی رباعی کہیں زیادہ قابل ترجیح ہے۔ چوتھے مصرعہ " دانم چکنم اگر ندانم چکنی " میں جو شوخی ہے اس نے اس رباعی کی لطافت کو کہیں زیادہ بڑھا دیا ہے۔

ایک اور رباعی میں سعدی کہتے ہیں:

اے بے رخ تو چو لالہ زارم دیدہ   گریندہ چو ابر نو بہارم دیدہ

روزے بینی در آرزوے رخ تو   چو اشک چکیدہ در کنارم دیدہ

خسرو کہتے ہیں :

روزے کہ در آئی چو تو خورشید وشی   در خانۂ من بندہ خرامندہ، خوشی

برخیزم و دیدہ را بہ پیش تو کشم   چون نیست مرا بہتر ازین پیش کشی

سعدی محبوب کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ تمہارے فراق میں میرا یہ حال ہے کہ ایک دن تم

دیکھو گے کہ میری آنکھیں بھی آنسو کی طرح ٹپک پڑیں گی۔ خسرو کہتے ہیں کہ میں نے آنکھیں بچا کے رکھی ہیں کہ ایک دن تم میرے گھر آؤ تو انہیں نکال کر تمہارے سامنے پیش کر دوں کیونکہ اس سے بہتر کوئی پیش کش میرے پاس نہیں ہے۔ دونوں رباعیاں خوب ہیں اور ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا مشکل ہے۔ پھر بھی دونوں میں بیان کا کچھ فرق ضرور ہے۔ سعدی کے بیان میں احساس محرومی انتہا کو پہنچ گیا ہے۔ اس قنوطیت کا سبب سعدی کا صرف اپنا بیان ہے اور اس بیان پر کوئی شاہد نہیں۔ اگرچہ "روزے بینی" یعنی "ایک روز تم دیکھو گے" کہہ کر محبوب کو خود اپنی حالت پہ گواہ بنایا ہے۔ لیکن یہ دیکھنا سُننے کے معنی میں ہے۔ کیونکہ فراق میں دیکھنا کیسا۔ اس کے برعکس خسرو کے بیان میں رجائیت ہے اس لئے انہوں نے آنکھیں بچا کر رکھی ہیں تاکہ محبوب جب اس کے گھر آئے تو وہ اس کے سامنے آنکھیں نکال کر پیش کر دے گا۔ اس وقت محبوب بچشم خود اس کی حالت کا مشاہدہ کرے گا۔ اور پھر کسی طرح انکار کی گنجائش نہ ہوگی لیکن یہ بیان کے منطقی نتائج ہیں۔ سعدی کے بیان میں جذبہ، سادگی اور محرومی کا جو اظہار ہے اس سے شعر میں تاثیر اور بیان میں بڑی کشش پیدا ہو گئی ہے۔

چوتھی رباعی میں سعدی کہتے ہیں :

اے پیش تو لعبتان چینی حبشی   کس چون تو صنوبر نخرامد بکشی

گر روی بگردانی و گر سر بکشی   ما با تو خوشیم اگر تو با ما نہ خوشی

خسرو کہتے ہیں :

آزار من دل شدہ اے یار مخواہ   گشتی چو ز حال دلم آگاہ، مخواہ

من بندہ ترا بجان و دل میخواہم   تو خواہ بخواہ بندہ را خواہ مخواہ

اس میں خسرو کی رباعی کا کینوس زیادہ وسیع ہے۔ اگرچہ یہاں جو گہرا تاثر پیدا کرنا چاہیے، ان سے یہ دونوں رباعیاں خالی ہیں۔

رباعی میں سعدی کا درجہ خسرو سے یقیناً بلند ہے لیکن خسرو کے فخر کے لئے یہ کچھ کم نہیں ہے کہ انہوں نے بعض ایسی رباعیاں بھی لکھی ہیں جو سعدی کی رباعیوں پر بھی فوقیت رکھتی ہیں۔

خسرو نے مختلف موضوعات پر جو چند رباعیاں لکھی ہیں ان میں بھی کچھ ایسی رباعیاں ہیں جو دل کش ہیں اور فنی اعتبار سے پختہ ہیں۔ آخر میں ہم چند ایسی رباعیاں یہاں پیش کرتے ہیں:

ملک غازی کی مدح میں کئی رباعیاں لکھی ہیں۔ ان میں سے تین ۳ رباعیاں پیش کی جاتی ہیں۔

غازی ملکا زمانہ خاک درِ تست — واقبال کمینہ بندہ و چاکر تست
بر سر کلہِ سبز تو زیبد از آنکہ — سرسبزی عالم ز کلاہ سر تست

تیغِ تو کہ خصم را بسر می آید — در رزم چو آفتاب بر می آید
دستِ تو کہ دریاست کمان اندر وے — انصاف کہ ہمچو آب در می آید

صد شکر کہ آن صفدر والا رشُست — در چشمۂ حیوان خضر آسا رشست
ہر جا کہ کسے ست سر بدریا شوید — این طرفہ ندیدہ ام کہ دریا رشست

چند خمریہ بہاریہ رباعیاں بھی دیکھئے:

نوروز رسید و بوستان شد گلگون — مے نوش و مشو بدستِ اندیشہ زبون
بادے بنگر چون ہمی آید چون — از بیضۂ خاک طوطیِ سبزہ برون

مے خور کہ ز نوروز خبر می آید — وز ہر طرف ابر تیرہ در می آید
گوئی کہ صبا عنبرِ تر میسوزد — کز آتشِ لالہ دود بر می آید

نوروز گذشت آنکہ بصد ناز آید — وز آمدنش طرب در آغاز آید
از رفتن نوروز گل از خویش برفت — سالے باید کہ او بخود باز آید

مولانا اشرف علی تھانوی

اور

اصلاح معاشرت

از ڈاکٹر سید ولی حسین جعفری ٭

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی نے انگریزوں کو موقع فراہم کیا کہ وہ اور ان کے مبلغ مسلمانوں میں عیسائیت کی تبلیغ کے لئے وقف ہوجائیں جس کا منطقی نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی تہذیب و معاشرت کے جراثیم اسلامی معاشرت میں داخل ہونے لگے جن کے اثرات زائل کرنے کی فکر اس دور کے علماء کو ہوئی! اس کے لئے انہوں نے ضروری سمجھا کہ جگہ جگہ دینی تعلیم کے مدارس کھولے جائیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا مدرسہ دیوبند میں ۱۲۸۳ھ میں قائم کیا گیا۔ اس مدرسہ نے ایک باضابطہ تحریک کی شکل اختیار کی۔ کیونکہ مدرسہ کے بانیوں میں سے کئی علماء ایسے تھے جنھوں نے انقلاب ۱۸۵۷ء کے موقع پر شاملی پر قبضہ کرلیا تھا۔ اس وجہ سے عربی مدارس حکومت کی نظروں میں مشتبہ تھے۔ مزید برآں ان کے ہمدردوں میں کچھ لوگ وہ تھے جن کی نسبت حکام وقت کا یہ خیال تھا کہ انہوں نے ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں حصہ لیا تھا اور وہ مسلمانوں کا مذہبی جوش قائم کررہے تھے[1] اس مدرسہ نے "دین محمدی" کی تعلیم کو مقدم رکھا جس کو حکام وقت غضب کی نظروں سے[2] دیکھتے تھے[3]۔ انھیں اسباب کی بنا پر مدرسہ دیوبند کے بانی نہ صرف

۱؎ فرنگیوں کا جال امداد صابری۔ ص ۱۷۷، ۲؎ ایضاً ص ۱۸، ۳؎ ایضاً۔

٭ شعبۂ اسلامیات۔ ہمدرد یونیورسٹی۔

حکومت بلکہ امراء کے تعلقات سے احتراز کرتے تھے۔[1] اس کے برخلاف مدرسہ کے ذمہ داروں نے
مذہبی علوم خصوصاً حدیث نبوی کے تحفظ اور اس کی تعلیم و اشاعت کی طرف خصوصی توجہ دی اور اس کے
نتیجہ میں اس مدرسہ کے سند یافتہ نہ صرف ہندوستان بلکہ افغانستان و دیگر اسلامی ممالک میں درس
و تدریس و تبلیغ و اشاعت کے ساتھ ردِ نصاریٰ اور دوسرے اوہام باطلہ کے ازالہ میں مصروف رہے۔[2]
دیوبند تحریک سے پہلے بھی دین محمدی کی ترویج و اشاعت کا کام اس علاقہ میں ہوتا تھا (جو شمالی ہند کے
نام سے جانا جاتا ہے) اور اس سلسلے میں مرکزیت دھلی اور اس کے اطراف ہی کو حاصل تھی اور یہ سلسلہ
حضرت شاہ عبدالعزیز کی وجہ سے مقبول عام ہوا تھا۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے تحریک ردِ نصاریٰ بہت
زور و شور سے جاری رہی جس کی وجہ سے ہندوستان میں مسلمان عمومی طور پر عیسائی نہ ہوسکے اور یہ
تحریک مولانا رحمۃ اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خاں کے دم سے مزید مستحکم ہوئی۔ ان لوگوں نے
۱۸۵۴ء[3] میں پہلا مناظرہ آگرہ میں کر کے عامۃ المسلمین کے ذہن میں دین اسلام کے بارے میں
ان تمام شکوک و شبہات کا ازالہ کیا[4] جو میزان الحق کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے اور جو اس کے
مصنف کی دل شکن تقریروں سے بڑھا تھا۔

مولانا اشرف علی بن عبدالحق ضلع مظفرنگر کے قصبہ تھانہ بھون میں ۱۲۸۰ھ میں[5] پیدا ہوئے۔[6]
مولانا کا گھرانہ اپنے علاقے میں بہت مشہور آپ دادھیال کی طرف سے فاروقی اور ننہال کی طرف سے
علوی ہیں۔[7] آپ کی تعلیم کی ابتدا حفظ قرآن پاک سے ہوئی تھی۔ پھر ابتدائی فارسی میرٹھ میں پڑھی اور
انتہائی ابوالفضل تک اپنے ماموں واجد علی صاحب سے پڑھیں۔[8] پھر دینی تعلیم کی تکمیل کے لئے دیوبند
گئے۔ دارالعلوم دیوبند میں آپ پانچ چھ سال ۱۲۹۵ھ میں داخل ہوئے اور ۱۳۰۱ھ میں فارغ التحصیل

[1] فرنگیوں کا جال امداد صابری ص ۱۹؛ [2] ایضاً ص ۷۹؛ [3] ایضاً ص ۴۲؛ [4] ایضاً ص ۷۵ [5] ایضاً ص ۲۰۸ [6] اشرف السوانح عزیز الحسن مجذوب ص ۸ [7] ایضاً ص ۱۱

ہو کر نکلے۔[1] مولانا نے جن اساتذہ کرام سے دیوبند میں استفادہ کیا وہ لوگ اپنے فن کے امام تھے جیسے
مولانا یعقوب صاحبؒ، مولانا سید احمد صاحبؒ، جناب ملا محمود صاحبؒ، جناب مولانا عبدالعلی صاحبؒ
اور مولانا محمود حسن صاحبؒ۔ نیز قرآن آپ بہت ہی خوش الحانی سے پڑھتے تھے۔ جس کی تربیت آپ نے
مشہور قاری محمد عبداللہ صاحبؒ مہاجر مکی سے بمقام مکہ معظمہ لی تھی جو قراء عرب کے نزدیک ایک
نہایت جید قاری تھے۔[2]

آپ ابتدا ہی سے درس و تدریس میں مشغول ہوگئے تھے۔ فراغت کے فوراً بعد اس نیت سے
کانپور آنا ہوا اور یہاں مدرسہ فیض عام سے وابستگی اختیار کی۔[3] اس دوران مواعظ اور تصانیف کا سلسلہ بھی
جاری رہا، فتاویٰ کا کام بھی اپنے ذمہ لے لیا۔ جب مدرسی شروع کی تو مولانا بالکل نوجوان تھے لیکن
کانپور پہنچ کر مدرسہ کے جملہ مدرسین اور اہل شہر میں بہت جلد مقبول اور ہر دلعزیز ہوگئے۔[4] مدرسہ
فیض عام میں تین چار ماہ کام کرنے کے بعد آپ مدرسہ جامع العلوم سے وابستہ ہوگئے۔ یہ مدرسہ
اب بھی اسی نام سے موجود ہے۔[5] یہاں آپ کا قیام چودہ برس تک رہا اور جس میں درس و تدریس
کے علاوہ مواعظ و تصانیف اور ارشاد و تلقین کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ بالآخر آپ ۱۳۱۵ھ میں اپنے
وطن تھانہ بھون منتقل ہوگئے۔ مولانا کا زمانہ طالب علمی دراصل مناظرہ بازی کا دور تھا۔ ان کو اس
بات کا اعتراف ہے کہ انہیں اس زمانہ میں جتنا مناظروں کا شوق تھا اب اس سے اتنی ہی نفرت
ہے۔[6] علمائیوں، آریوں، شیعوں اور غیر مقلدوں سب ہی سے طالب علمی کے زمانہ میں مناظرے
کئے۔[7] مگر بعد میں ایسی مجالس سے اجتناب فرماتے تھے۔ مولانا کے مطابق اس کی وجہ یہ ہے کہ
اکثر اس زمانہ میں مناظرین کے اعتراضات فاسد ہوتے ہیں جس سے کوئی نفع نہیں حاصل ہوتا الٹا
کج بحثی اور ہٹ دھرمی کی عادت پڑ جاتی ہے اور حقیقت شناسی کی استعداد برباد ہو جاتی ہے۔[8]

[1] اشرف السوانح عزیز الحسن مجذوب ص ۲۵ [2] ایضاً ص ۳۳ [3] ایضاً ص ۳ [4] ایضاً ص ۳۰ [5] ایضاً ص ۳۰ [6] ایضاً ص ۲۹
[7] ایضاً ص ۳۰۔

مولانا کو معقولات سے مناسبت ہونے کے باوجود منقولات کے مقابلہ میں ان فنون سے نفرت رہی۔ مولانا کے بارے میں مشہور تھا کہ معقولات جب پڑھاتے تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بجائے اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھتے تھے[۱] مولانا کے زمانے کے اکثر علما حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے وابستہ تھے جو اپنے دور میں علوم باطنی کے سرچشمہ تھے۔ چنانچہ مولانا تھانوی بھی حاجی امداد اللہ سے مکہ شریف جاکر اپنے والد کے ہمراہ بیعت ہوئے۔ گرچہ اس کی تمنا ان کے دل میں ۱۲۹۹ھ میں ہی پیدا ہوگئی تھی[۲] جب کہ مولانا رشید احمد گنگوہی حج کے لئے جارہے تھے۔

ان سے بیعت کے بعد مولانا نے مواعظ کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ جس کی افادیت اور عمومی فیض کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں:

"اصلاح امت کی کوشش میں علمی و عملی زندگی کے ہر گوشہ پر ان کی نظر تھی۔ بچوں سے لے کر بوڑھوں تک، عورتوں سے لے کر مردوں تک، جاہلوں سے لے کر عالموں تک، عامیوں سے لے کر صوفیوں، درویشوں اور زاہدوں تک، غریبوں سے لے کر امیروں تک ان کی شخصیت مصروف اصلاح و تربیت رہی۔ پیدائش، شادی بیاہ، غمی اور دوسری تقریبوں اور اجتماعوں تک کے احوال پر ان کی نظر پڑی اور شریعت کے معیار پر جانچ کر ہر ایک کا کھرا کھوٹا الگ کیا۔ رسوم و بدعات اور مفاسد کے ہر روڑے اور پتھر کو ہٹا کر صراط مستقیم کی راہ دکھائی۔ تبلیغ تعلیم سیاست معاشرت اخلاق و عبادات اور عقائد میں دین خالص کے معیار سے جہاں کوتاہی نظر آئی اس کی اصلاح کی۔ فقہ کے نئے نئے مسائل اور مسلمانوں کی نئی نئی ضرورتوں کے متعلق اپنے نزدیک پورا سامان مہیا کر دیا اور خصوصیت کے ساتھ احسان و سلوک کی جس کا مشہور نام تصوف ہے تجدید فرمائی۔ ان کے سامنے دین کی صحیح مثال تھی اسی کے مطابق مسلمانوں کی موجودہ زندگی کی

---

[۱] اشرف السوانح عزیز الحسن مجذوب ص ۱۳۱ [۲] ایضاً ص ۱۴۶۔

تصویر میں جہاں جہاں نقائص تھے ان کے درست کرنے میں عمر بھر مشغول رہے۔ انہوں نے اپنی زندگی اس میں صرف کر دی کہ مسلمانوں کی تصویر حیات کو اس شبیہ کے مطابق بنادیں جو دین حق کے مرقع میں نظر آتی ہے۔"[۱]

مولانا نے ہمیشہ اپنے مواعظ میں مصلحت عامہ ہی کا خیال رکھا اور فرمائشی مضامین سے احتراز کیا[۲] اس وجہ سے کہ یہ اغراض پر مبنی ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کا اثر اچھا نہیں پڑتا بلکہ برا ہوتا ہے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب حجۃ اللہ البالغہ، میں ایک باب قائم کیا ہے "بیان ما کان علیہ حال اہل الجاہلیۃ فاصلحۃ النبیؐ"[۳] اس میں یہ حدیث نقل کی ہے "بعثت بالملۃ الحنیفیۃ الاسماعیلیۃ لاقامۃ عوجہا و ازالۃ تحریفہا و اشاعۃ نورہا" یعنی میں اس واسطے مبعوث ہوا ہوں کہ ملت اسماعیلیہ کی کجی کو دور کروں اور اس کے تغیر و تبدل کی اصلاح کروں اور اس کی روشنی کو پھیلاؤں۔ آپ کی بعثت کا یہی مفہوم قرآن میں اس طرح بیان ہوا ہے:

هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا	اللہ نے انہیں میں سے بھیجا رسول جو
مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ	انہیں تلاوت آیات بتاتے ہیں اور تزکیۂ
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۔[۴]	نفس کرتے ہیں اور ان لوگوں کو تعلیم کتاب
	و حکمت دیتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصلاح الناس ایک اسلامی فریضہ ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔[۵] امت مسلمہ

---

[۱] جامع المجددین ص ۲۷ تا ۲۸ [۲] اشرف السوانح عزیز الحسن مجذوب ص ۶۲ [۳] حجۃ اللہ البالغہ باب ۲۱ جلد اول ص ۲۹۲ [۴] سورہ جمعہ آیت ۲ [۵] سورہ آل عمران آیت ۱۱۰۔

کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ بھلائی کی طرف بلائے اور منکرات سے روکے اور یہ ذمہ داری ہر ہر مسلمان پر اس کے علم کی وسعت اور اس کی حیثیت کے مطابق عائد ہوتی ہے اور یہ ذمہ داری اس وقت بڑھ جاتی ہے جب لوگ رسم و رواج کے اس قدر پابند ہو جائیں کہ ان کو فرض و واجب کے چھوٹنے کا افسوس نہ ہو تو اور بڑھ جاتی ہے۔

اس پس منظر میں مولانا نے اصلاح رسوم و اصلاح معاشرت کے کام کو اپنے ہاتھ میں لیا اور خیر امت کا فریضہ انجام دیا جو کار نبوت ہی کا ایک حصہ ہے۔ کیونکہ رسول اللہؐ نے دعوت ایمان کے ساتھ اصلاح معاشرہ کا کام بھی کیا۔ بلکہ اس وقت کے رسم و رواج کو یکسر بدل دیا۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے اس پس منظر پر یہ چشم کشا تبصرہ کیا ہے:

"انگریزی تعلیم کا دور شروع ہونے سے پہلے رونا اس کا تھا کہ مسلمان انڈو ایرانین تہذیب کے زیر اثر مشرکانہ عادات و اخلاق میں اس طرح جکڑ گئے تھے کہ ان کی معاشرت اور ان کے رہن سہن کا طور طریق بڑی حد تک غیر اسلامی ہو گیا تھا۔ شادی اور غمی، مرنے اور جینے کی تمام تقریبات اسی مشرکانہ طریق زندگی کا مظہر ہوتی تھیں۔ عقد بیوگان کو حرام سمجھتے تھے نماز روزہ کی پروا نہیں۔ لیکن عرس میں شرکت کرنے والے بزرگوں سے منتیں اور ان کی نذر نیاز، تیجہ اور سوئم اور چہلم امام حسین کا تعزیہ بنانا۔ محرم کے دنوں میں سیاہ پوشی، بیاہ شادی کے موقع پر مہندی مایوں چوتھی چالہ آرسی مصحف یہ سب فرض عین۔ اسلام کی سادہ اور تعلیمات حقہ کا پتہ نہیں اور بدعات و محدثات کا گھر گھر چرچا۔ اب انگریزی تعلیم کا چرچا ہوا اور اس تعلیم کے جلو میں مغربی تہذیب و تمدن کی کارفرمائی بھی شروع ہوئی تو عقیدہ اور عمل کی گمراہی کا ایک نیا دروازہ کھل گیا۔ انگریزی زبان سے واقف ہونے کے بعد جو نوجوان مسیحی مصنفین یا مغرب کے آزاد خیال ارباب قلم کی کتابیں پڑھتے تھے تو چونکہ ان کو براہ راست اسلام کی تاریخ اور اس کی دینیات و روایات سے واقفیت نہیں ہوتی تھی اس بنا پر وہ ان کتابوں کے اثرات کو فوراً قبول کر لیتے تھے"[1]

حقیقت یہ ہے کہ مذہب اسلام کی اصل روح بہت کمزور ہو گئی تھی اور مذہب چند بدعات و محدثات اور رسوم کا نام ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اصل دین کی تعلیم کا فقدان تھا۔ قرآن و حدیث سے مسلمان منحرف تھے اور جو چیزیں منافی اسلام یا خارج از اسلام تھیں مثلاً پیروں اور فقیروں کی نذر و نیاز عرس و قوالی، شادی بیاہ اور ولادت و وفات کے رسوم، ان کو اسلام سمجھنے لگے تھے۔

مولانا نے اسلام کی تعبدی حیثیت کو مضمحل نہیں ہونے دیا[2] بلکہ انہوں نے اس پر اتنا زور دیا کہ ایک طرح سے توازن پیدا ہو گیا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ بیسویں صدی کی ابتدا میں ہندوستان کے مسلمانوں میں نشاۃ ثانیہ یا تجدید دین کے جو اثرات ظاہر ہوئے ان حالات میں اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔

مولانا نے اپنے مواعظ اور کتب و رسائل کے ذریعہ اس کام کو آگے بڑھایا۔ ان کے یہاں حق العباد کا معاملہ بہت نازک ہے کیونکہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ ہمیشہ اٹھتے بیٹھتے ہیں لین دین کرتے ہیں اسی لئے شریعت نے بھی ان مسائل پر بڑی توجہ دلائی ہے۔ اللہ نے معاشرت اور اخلاق کی حدیں مقرر کی ہیں ان میں کمی زیادتی کرنا بندوں کی تکلیف اور خدا کی ناراضگی کا سبب ہوتا ہے[3]۔ اپنے ایک وعظ میں مولانا کہتے ہیں حکیم اور ڈاکٹر کے نسخے سے تجویز کردہ دوا صحیح وقت پر اور ڈاکٹر کی تجویز کردہ مقدار میں نہ دی جائے تو نقصان کا سبب بن جاتی ہے۔ ان کا ایک وعظ[4] استخفاف المعاصی پر ہے جس میں گناہوں کو معمولی سمجھنے کی مذمت ہے۔ گناہ دراصل اللہ کی ناراضگی و نافرمانی کا نام ہے اور گناہ کو معمولی سمجھنا نہایت مہلک ہے کیونکہ معمولی سمجھ کر اس سے توبہ کا ارادہ مشکل ہے اور چھوٹے گناہوں کی عادت

---

[1] ماہنامہ برہان اکتوبر ۵۳ء ص ۲۳۷، ۲۳۸ [2] ایضاً دسمبر ۵۲ء ص ۳۶۵ [3] وعظ حقوق المعاشرت، ماخوذ از ریحانۃ ضیاء مولانا تھانوی کی تفسیر بیان القرآن ص ۵۳ [4] ایضاً ص ۵۴۔

رفتہ رفتہ بڑے گناہوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اس کے لیے وہ آگ اور چنگاری کی مثال دیتے ہیں[۱] یعنی گناہ صغیرہ کو وہ چنگاری کے مطابق سمجھتے ہیں۔ وعظ و تقریر کے ذریعہ بہت ہی حکیمانہ انداز میں مولانا اپنی بات سمجھاتے اور بتاتے ہیں کہ گناہِ صغیرہ سے نہ بچنے ہی سے رفتہ رفتہ آدمی گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہوجاتا ہے جس طرح صاف کپڑے کو بارش میں کیچڑ سے بچایا جاتا ہے اور جب بہت سے چھینٹے پڑ جاتے ہیں تو پھر دامن کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے اور وہ کپڑا بالکل خراب ہوجاتا ہے[۲] اپنے وعظ ذکر الرسول میں مولانا نے بہت ہی اہم نقطہ کی طرف توجہ دلائی ہے کہ حضورؐ سے محبت کے علاوہ دوسرے حقوق بھی ہیں جن کی ادائیگی اشد ضروری ہے۔ اگر حضورؐ کی فقط عظمت و محبت ہے۔ بغیر اطاعت کے تو اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس طرح اطاعت بغیر عظمت و محبت کے ایک بے فائدہ چیز ہے[۳] کثرت درود کو مولانا حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر احسان نہیں بلکہ اپنے ذاتی فائدہ کی چیز بتاتے ہیں[۴]

مولانا نے الکمال فی الدین النساء میں عورتوں کی اصلاح کی شدید ضرورت پر اس لیے زور دیا ہے کہ بچوں کا پہلا گہوارہ ماں ہوتی ہے۔ قرآن میں کثرت سے مردوں سے خطاب کا مطلب عورتوں سے بے اعتنائی نہیں احکام و فرائض اور حصول اجر میں مرد و عورت میں یکساں ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کا خمیر ہونے کی وجہ سے الگ الگ خطاب کی ضرورت نہیں سمجھی گئی[۵]۔ اس وعظ میں مولانا نے عورتوں کی خاص کمزوری ناشکری، حرص، اپنی حیثیت سے بڑھی ہوئی عورتوں سے میل جول کی خاص طور پر نشاندہی کی ہے۔ مولانا نے حدیث کی روشنی میں یہ بتایا کہ اپنے سے کم حیثیت کی عورتوں کے حالات پر غور کرو تاکہ حقیقت شکر پیدا ہو برخلاف اس کے دین کے معاملات میں اپنوں سے زیادہ دیندار پر نظر کی جائے تاکہ عمل میں اضافہ ہو[۶] مولانا کے مطابق درجہ کمال دین میں عورتوں کو بھی حاصل ہوسکتا ہے۔ بشرطیکہ

۱؎ وعظ حقوق المعاشرت ماخوذ از ریحانہ ضیاء مولانا تھانوی کی تفسیر بیان القرآن ص ۵۵ ۲؎ ایضاً ۳؎ ایضاً ص ۷۶ ۴؎ ایضاً ص ۷۵ ۵؎ ایضاً ص ۷۵ ۶؎ ایضاً۔

مسائل اور احکام شرعیہ پر کتابوں کے ذریعہ عبور حاصل کریں تاکہ عمل میں کمال حاصل کر سکیں[۱]۔ یا اگر کوئی کام مرد محارم میں مل جائے تو اس سے فائدہ اٹھائیں اور اپنی اصلاح کے طریقے معلوم کریں اور اگر مرد کامل میسر ہو تو کسی کاملہ کی طرف رجوع کریں۔ آخری درجہ میں مولانا کسی غیر محرم بزرگ سے خط و کتابت کے ذریعہ اصلاح کا مشورہ دیتے ہیں[۲] اپنے وعظ شرائط الطاعیہ میں مولانا نے عبادات اور احکام شرعیہ کو افراط و تفریط سے محفوظ رکھنے پر زور دیا ہے۔ احکام شرعیہ کو ان کے حدود میں قائم رکھنا اصل عبادت ہے۔ مولانا کے مطابق "نہ تو جاہلوں کی طرح ہر سفر کو افطار صوم سمجھو اور نہ بعض عالموں کی طرح سفر شرعی میں افطار واجب سمجھو، سفر غیر شرعی میں روزہ رکھنا واجب ہے اور سفر شرعی جو ۴۸ میل سے زائد ہو اس میں افطار جائز ہے[۳]" مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا "بس یہ دیکھ لیا کہ یہ دین کا کام ہے پھر یہ خیال نہیں کرتے کہ یہ حدود کے اندر ہے یا نہیں حالانکہ شریعت میں فلاں فلاں وقت نماز جائز ہے، فلاں فلاں وقت روزہ جائز ہے۔ پھر فرماتے ہیں نماز کیسی اچھی چیز ہے لیکن ایک صحابی کو حضورؐ نے کثرت نماز پر جو حقوق العباد کو ختم کر دے اس طرح فرمایا تم پر تمہاری جان کا حق ہے، تمہاری بیوی کا حق ہے، تمہارے مہمان کا حق ہے۔ اس طرح رہو کہ ذی حق کا حق فوت نہ ہوجائے، اس طرح رہو کہ بیمار نہ پڑ جاؤ[۴]۔ مولانا کی کتابیں بھی اصلاح معاشرت کے موضوع سے بھری ہوئی ہیں۔ انہوں نے معاشرہ کا بہت گہرائی سے مطالعہ کیا اور اس کے بعد جو چیزیں ان کو کھٹکیں اس کی اصلاح کی خاطر نہ صرف مکمل اصلاحی نظام معاشرت پیش کیا بلکہ خود عمل کر کے دکھایا اور اپنے حلقہ بگوش حضرات کو بھی اس کا پورا پورا پابند کرایا۔ مولانا نے قرآن و حدیث سے اپنے اصلاحی پروگرام کے تمام مضامین کو مدلل پیش کیا ہے۔ اس سلسلہ کی ایک کتاب حیات المسلمین لکھنے کی وجہ وہ خود بیان کرتے ہیں "مسلمانوں کی بدحالی سے مجھے سخت قلق ہوا،

۱؎ وعظ حقوق المعاشرت ماخوذ از ریحانہ ضیاء مولانا تھانوی کی تفسیر بیان القرآن ص ۵۸ ۲؎ ایضاً ۳؎ ایضاً ص ۵۹ ۴؎ ایضاً۔

بعض اعمال کو بعض مصیبتوں کے دور کرنے میں خاص دخل ہے ان میں سے بعض اعمال سے
تو جہل دور ہوتا ہے اور بعض سے افلاس اور بعض سے پریشانی اور یہی تینوں جہل افلاس و تشویش
ہی تمام بلاؤں کی جڑ ہیں، ان تینوں کی اصلاح سے اور تمام باتوں کی بھی اصلاح ہو جائے گی[1] مزید
یہ کہ اس کے دیباچہ میں یہ بات واضح کی ہے کہ زندگی چاہے دنیوی ہو یا اخروی دونوں کی اصلاح
کا دارومدار اور اس کا واحد علاج رسول اللہ ﷺ کے پاس ہے کہ اگر وہ حضور ﷺ کی بتائی ہوئی اسلامی
تعلیمات کو سامنے رکھ کر دنیا و آخرت کے مسائل اور پریشانیوں کو دور کرنے کی تجویزوں پر جو
حضور ﷺ کی بتائی ہوئی ہیں عمل کرے تو کامیاب ہوگا[2] مزید یہ کہ اسلامی تعلیمات سے روگردانی کے
نتیجہ میں مسلمانوں پر دنیوی اور اخروی بلائیں نازل ہو رہی ہیں[3] مولانا کہتے ہیں کہ جس طرح دوائیں
مختلف صورتوں میں عمل کرتی ہیں اور مرض کو دور کرتی ہیں اسی طرح انسانوں کے اعمال بھی اپنی
خاصیت کے اعتبار سے مختلف تاثیر رکھتے ہیں اور مختلف طور پر اثر کرتے ہیں[4] ویسے مجموعی طور پر
اس کتاب میں عقائد و اعمال پر گفتگو ہے جس کو اپنا کر انسان ایک اچھا انسان بن سکتا ہے۔
جیسے ایمان، اسلام، علم دین، تلاوت قرآن، خدا اور اس کے رسول ﷺ سے تعلق، تقدیر، عمل، توکل،
دعا، صالحین کی صحبت، سیرت نبوی ﷺ، مسلمانوں کے حقوق کی ادائیگی، اپنے نفس کے حقوق کی ادائیگی، نماز کی پابندی، مسجد کی تعمیر،
ذکر الٰہی، زکوٰۃ، صدقہ، روزہ، حج، قربانی، آمدنی و خرچ کا انتظام، نکاح، افزائش نسل، دنیا سے
دل نہ لگانا، تعدیل حقوق والدین، یعنی کسی کا حق کسی کے لئے برباد کر کے دوسرے کو نہیں دینا چاہئے،
جیسے بچوں کے حقوق تلف کر کے والدین کے حقوق دینا اور اس کو دین سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے۔
گناہوں سے بچنا، صبر و شکر سے کام لینا، مشورہ کرنا، باہم محبت و ہمدردی و اخلاق سے پیش آنا اپنے

---

[1] وعظ حقوق المعاشرت ماخوذ از تالیفات اشرف مولانا تھانوی کی تفسیر بیان القرآن ص ۶۰ [2] ایضاً ص ۶۱
[3] ایضاً ص ۶۲ [4] ایضاً ص ۶۳۔

لی مسائل کو اسلام کے مطابق حل کرنا وغیرہ۔ مولانا اپنی اس کتاب کو بہت پسند کرتے تھے، مولانا نے
اس سلسلہ میں بہشتی زیور لکھ کر خواتین کے لئے ایک اہم کام انجام دیا یہ کتاب حنفی مسلک کی نمائندگی کرتی
ہے۔ اس میں عام فہم انداز میں عورتوں کو تعلیم دی گئی ہے اور عورتوں سے متعلق اسلامی زندگی کے تمام
مسائل کا احاطہ کیا گیا ہے۔ لین دین۔ شادی طلاق۔ پاکی و ناپاکی۔ مذہبی و معاشرتی مسائل اس میں بڑے
سہل انداز میں بیان کئے گئے ہیں اور مسائل اور اصول بھی اس میں ملتے ہیں۔ عقائد، اعمال، اخلاق جیسے
دین کے اہم مسائل کو اسلامی اصولوں کی صحیح روشنی میں بتایا گیا ہے۔ در حقیقت دینی اور دنیوی دونوں قسم کی
ضرورتوں کے پیش نظر اس میں تمام مسائل موجود ہیں۔ اصلاح گھر سے اور ماں کی گود سے شروع ہو،
اس کے پیش نظر مولانا نے اسے عورتوں ہی کے لئے مرتب کیا حالانکہ ایک حصہ اس میں مردوں کے لئے
بھی ہے۔ ویسے یہ دس حصوں پر مشتمل ہے جو عورتوں کے بارے میں ہے۔ اصلاح الرسوم جیسا کہ
کتاب کے نام سے معلوم ہوتا ہے کہ رسم و رواج کی اصلاح کے لئے مولانا نے اس کو تصنیف کیا۔
مولانا نے رسوم و بدعات کو ختم کرنے کے واسطے اس اہم موضوع کو اپنایا بلکہ یہ ان کی زندگی کا مشن ہی
ہو کر رہ گیا۔ اس کے پہلے باب میں ان رسوم کا ذکر ملتا ہے جن کو کرنے والے بھی گناہ سمجھتے ہیں اور
اسراف کو بڑھاتے ہیں اس سے معاشرہ پر غلط اثرات مرتب ہوتے اور عوام میں سبقت کا جذبہ
پیدا ہوتا ہے جو کہ مہلک اثرات پیدا کرتے ہیں۔ ناچ۔ شطرنج۔ تصویریں رکھنا۔ کتا پالنا۔ آتش بازی
وغیرہ اس میں شامل ہیں۔

اس کے بعد ایسی رسمیں جن کو لوگ جائز سمجھ کر کرتے ہیں۔ اس میں ختنہ، پیدائش کی رسمیں،
عقیقہ، بسم اللہ کی رسم، منگنی، شادی کی رسمیں، مہر زیادہ رکھنے کا رواج۔ پھر مولانا نے ان رسموں کی طرف
نشاندہی کی ہے جن کو ثواب اور دین سمجھ کر کرتے ہیں۔ جیسے فاتحہ، موت کے بعد اور اس وقت کی رسمیں
اور رمضان میں حافظ کو گھر بلا کر تراویح سننا۔ عید کی رسمیں، میلاد کی رسمیں، شب براۃ کا حلوہ، محرم کا

کپھڑا اور شربت تبرکات کی زیارت کے وقت جمع ہونا۔ ان سب رسوم میں کتنا دین ہے اور کتنی چیزیں غیر ضروری اور گناہ کی طرف لے جاتی ہیں۔ ایک قاری کو اطمینان بخش جواب مل جاتا ہے۔

مولانا کے نزدیک اصلاح معاشرت کی اہمیت و اولیت کا خیال رکھنا چاہیئے۔ اس میں اول چیز وہ یہ بتاتے ہیں" عورتوں کا علوم دینیہ سے ناواقف ہونا ہے جس کے نہ ہونے سے ان کے عقائد، ان کے اعمال، ان کے معاملات، ان کے اخلاق ان کا طرز معاشرت سب برباد ہے اور جو بچے ان کی گود میں پلتے ہیں ان کا طرز عمل بھی خراب ہوتا ہے اور اس طرح سے دین بھی ان کا برباد اور دنیا بھی بے مزہ۔ کیونکہ بداعتقادی سے بداخلاقی اور بداخلاقی سے بداعمالی اور بداعمالی بدمعاملگی جز ہے تکدرِ معیشت کا۔ مولانا کی رائے اگر شوہر بھی انہی جیسا ہو تو فساد میں اور ترقی ہوتی ہے۔ جس سے آخرت کی بربادی یقینی ہے مگر اکثر اوقات اس فساد کا انجام باہمی نزاع کی صورت میں نکلتا ہے اور دنیا بھی ویران ہوتی ہے[1]

اس پس منظر کو سامنے رکھ کر مولانا نے خواتین کے لئے ایک ایسی کتاب ترتیب دی ہے جو جمیع ضروریاتِ دین کو حاوی ہو[2] مولانا خود بھی فرماتے ہیں کہ اس کا نام بمناسبت مذاق نسواں کے بہشتی زیور رکھا گیا[3] مولانا کے مطابق کیونکہ اصلی زیور بھی کمالاتِ دین ہیں جن کی بدولت جنت میں زیور پہننے کو ملے گا[4]

اصلاح تعلیم نسواں کے مولانا اپنے وقت میں بہت حامی تھے لیکن مولانا اس میں اصلاح چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ فرماتے تھے کہ علوم سے غرض نوکری نہیں بلکہ وہ علوم ہیں جن سے انسان کے عقائد، اعمال و معاملات و معاشرت و اخلاق درست ہوں[5] کسبِ معاش کی ضرورت صرف مردوں کو ہوتی ہے اور عورتوں کا ذمہ اور ان کا نان ونفقہ صرف مردوں کے ذمہ ہے[6] دوسرے

[1] بہشتی زیور ص ۳۹ [2] ایضاً ص ۴ [3] ایضاً ص ۵ [4] ایضاً [5] ایضاً ص ۸۵ [6] ایضاً ص ۹۰۔

اس وجہ سے کہ اسلام میں پردہ کی تاکید ہے اور ابواب خاصہ معاش جو خاص علوم پر موقوف ہیں پردہ کے ساتھ حاصل نہیں کیے جاسکتے۔ مولانا کے مطابق اس لئے عورتوں کے لئے یہ تعلیم بالکل فضول ہے۔

تعلیم نسواں نے جب ایک مہم کی صورت اختیار کی تو اس کو سامنے رکھ کر مولانا نے اس کی اصلاح کی طرف توجہ کی جس میں آزاد و بے باک عورتوں سے تعلیم دلانے پر بھی مولانا ٹوکتے ہیں اور مزید وضاحت کرتے ہیں کہ یہ تجربہ ہے کہ ہم نشیں کے اخلاق و جذبات کا آدمی میں ضرور اثر آتا ہے، مولانا کی رائے میں سب سے بڑھ کر عورت کی حیا ہی اصل کنجی ہے۔ یعنی تمام خیر کی جب یہی چیز نہ رہی تو اس سے پھر نہ کوئی خیر متوقع ہے نہ کوئی شر محال[1] مولانا کے ملفوظات اور ان کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لڑکیوں کی تعلیم کو خالص دینی ماحول میں دیکھتے ہیں۔ نیک عورتوں کا ذکر کر کے وہ عمومی طور پر عورتوں کو بے رحمی سے روکتے ہیں اور ان کو صلہ رحمی پر ابھارتے ہیں اصلاح النساء اور کسوۃ النساء جملہ عورتوں کے عیوب کی نشاندہی نیز موخر الذکر ملفوظ میں ترغیب اور ترہیب کا مضمون باندھتے ہیں۔ لڑکیوں کا عام زنانہ اسکول، دیگر مدارس عامہ کی طرف بنانے کی مولانا حمایت نہیں کرتے کیونکہ اس میں مختلف اقوام مختلف طبقات اور مختلف خیالات رکھنے والی لڑکیوں کا روزانہ جمع ہونا گو معلمہ مسلمان ہی کیوں نہ ہوں ایسے اسباب جمع ہو جاتے ہیں جن کا ان کے اخلاق پر بُرا اثر پڑتا ہے اور یہ جمع ہونا اکثر عفت سوز ثابت ہوتا ہے[2] جب معاشرہ پر کوئی نکیر کرنے والا نہ ہو تو ایسے حالات میں جو طبقہ پروان چڑھتا ہے اور جو اسی ماحول میں صاحب تمیز ہوئے ہیں ان کی حالت اس کے برعکس ہے۔ ان کی عقل انہیں احادیث کو قبول کرتی ہے جو رواج کے موافق ہوں گو سنداً موضوع ہوں اور جو اس کے خلاف ہو وہ قابل رد ہے۔ خواہ وہ سنداً صحیح ہو۔ مولانا تھانوی کا فکر بالکل یکساں رہا اور قرآن کی آیت فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ[3]

[1] بہشتی زیور ص ۹۰ [2] ایضاً [3] سورہ ہود آیت ۱۱۲

پر اپنے پورے دور میں عمل پیرا رہے اس لئے کہ وہ اپنی فکر میں بالکل راسخ تھے اور علم دین کو سب سے اونچے مقام پر رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ علم دین کے برابر دنیا بھر میں کوئی دستور العمل اور کوئی تعلیم شائستگی اور تہذیب نہیں سکھا سکتی[1] نبوت کا مقصد بھی اصلاح معاشرہ ہے اس لئے کہ وہ بھی لوگوں کو اعتقاد اور اعمال کی ظاہری نجاستوں سے علیحدہ رہنے کی تعلیم دیتا ہے[2]۔ اصلاح معاشرہ ہی کے ضمن میں مولانا اس بات پر گرفت کرتے ہیں کہ قوم کے ہمدرد اپنی اولاد کو علم دین نہیں پڑھاتے۔ آج تک کسی ہمدرد قوم کو دیکھا نہیں گیا کہ اس نے قومی ہمدردی میں اپنے اولاد کو دین کی تعلیم دلائی ہو، کیونکہ یہ سمجھتے ہیں کہ علم دین پڑھ کر ہماری اولاد کو یہ بڑے بڑے عہدے کہاں ملیں گے[3] مولانا ہر ایک کو دین کی حفاظت کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ دین اسلام کو وہ شرکت کی جائداد کے مماثل قرار دیتے ہیں۔ نیز قرآن شریف کو بھی مسلمانوں کی شرکت کی جائداد کہتے ہیں کہ اس کی حفاظت سب کے ذمہ ہے[4] اتباع رسول کے ضمن میں مولانا نے ان باتوں کی اصلاح کی جانب توجہ فرمائی جس کے سدھرنے سے اتباع رسول ممکن ہے۔

مولانا نے عورتوں کے حقوق وراثت اور ان کی دینی تعلیم کی ضرورت و اہمیت پر بھی مفصل گفتگو کی ہے اور مشرقی و مغربی علوم میں توازن قائم رکھنے پر خاص زور دیا ہے، وہ علما و مشائخ کی تعلیم اور ان کی اصلاح و تربیت کو بہت ضروری خیال کرتے تھے۔ یہ ساری باتیں اصلاح معاشرت کے سلسلے میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ اسی لئے مولانا کی توجہ ان کی جانب مبذول رہی، ضرورت ہے کہ ان مسائل پر برابر لکھا جاتا رہے تاکہ مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح ہوسکے۔

---

[1] رحمۃ للعالمین جلد اول ص ۲۳ [2] ایضاً ص ۳۳ [3] الہادی محرم ۱۳۴۵ھ ص ۱۴ [4] ایضاً ص ۱۵

معارف کی ڈاک

جناب امین مسعود صدیقی کی معروضات

مہاپالیکا کالونی، تلک نگر، لکھنؤ۔

۱۲ جنوری ۲۰۰۱ء

مکرمی و محترمی السلام علیکم

"معارف" دسمبر ۲۰۰۰ء میں "مدیر" ہماری توحید کی معروضات" کے عنوان سے جو مراسلہ شایع ہوا ہے اس کے متعلق عرض ہے :

(۱) "نیا دور" حکومت اتر پردیش کا ماہوار ادبی و ثقافتی رسالہ ہے اس کی متواتر اشاعت جاری رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ "ہمدردان اردو" اس کے زیادہ سے زیادہ خریدار بنیں اور بنائیں۔ اگر وہ چاہیں تو یہ رسالہ جن کتب فروشوں کے یہاں سے دستیاب ہے وہاں سے ماہ بماہ بھی خرید سکتے ہیں۔ ورنہ اگر ضرورت کے مدنظر اس دفعہ "نیا دور" بند نہیں ہوسکا تو وہ دن دور نہیں جب اقتصادی مشکلات کا عذر کرکے حکومت اتر پردیش اس کو بند کردے۔ چودھری صاحب کا یہ فرمانا کہ دوسرے شہروں میں اس کو بند کرنے کے خلاف کوئی مہم نہیں چلی یا احتجاج نہیں ہوا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو خرید کر کم ہی لوگ پڑھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو کو آج کل اصل نقصان خود ساختہ ہمدردان اردو سے ہو رہا ہے۔ "نیا دور" کا حلقہ محدود ہوگیا ہے ... مولانا ابوالکلام آزاد صدی کے موقع پر اکثر اہم رسالوں کے خاص نمبر شایع ہوئے۔ لیکن "نیا دور" کا خاص نمبر تو در کنار کوئی گوشہ ابوالکلام آزاد بھی شایع نہیں ہوا۔ یقیناً جناب سبط محمد نقوی کو بھی اس امر سے بخوبی واقفیت ہوگی مگر پتہ نہیں کیوں انہوں نے اس کا ذکر مناسب نہیں سمجھا[1]

(حاشیہ ص ۱۵۴ پر)

(۲) "مولانا آزاد اور مسلم مسائل" کتاب پر معارف کے سرسری تبصرے پر اظہار رائے فرماتے ہوئے نقوی صاحب نے بہت کچھ دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا یہ اعتراف قابل تحسین ہے کہ اصل کتاب میری نظر سے نہیں گزری ہے"۔ لہٰذا تبصرے پر اپنی گراں قدر رائے تحریر فرمانے سے پہلے اگر وہ کتاب کا مطالعہ فرما لیتے تو یقین ہے کہ انہیں یہ طویل تحریر لکھنے کی ضرورت نہیں پیش آتی۔ حیرت ہے کہ ستمبر ۱۹۹۹ء میں شایع شدہ کتاب پر "معارف" میں اتنی تاخیر سے تبصرہ شایع ہوا اور اس سے بھی زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ نقوی صاحب نے فیروز بخت احمد کو جو بغیر کسی ثبوت کے اپنے کو مولانا آزاد کا پوتا ظاہر کرتے ہیں مزید معلومات فراہم کرنے کی دعوت دی ہے۔ اس پر کوئی وضاحتی نوٹ نہ ہونا افسوس ناک ہے۔

فقط

محمد امین مسعود صدیقی

معارف: حاشیہ ص ۱۵۳ لے ذکر حکومت کے نیا دور کو بند کر دینے کا تھا، اس میں اور باتوں سے تعرض کرنے کا کیا موقع تھا۔ آپ نے "نیا دور" کے بارے میں جو لب و لہجہ اختیار کیا ان میں مجبوراً قطع و برید کرنی پڑی، شکوہ بیجا کے لئے بھی شعور لازم ہے۔ (حاشیہ صفحہ ہذا) لے اب یہ کتاب نقوی صاحب کی نظر سے گزر چکی ہے اور وہ بھی مراسلہ نگار کے ہمنوا ہیں ۲ے معارف میں تبصرے کے صفحات محدود ہوتے ہیں اس لئے تاخیر لابد ہے، مراسلہ نگار کو معارف کی مجبوری سمجھنا چاہیئے ۳ے نقوی صاحب نے فیروز بخت احمد صاحب کو مولانا کا پوتا نہیں کہا ہے، اس لئے وضاحتی نوٹ دینا ضروری نہیں سمجھا گیا، مجرد اظہار خیال کی دعوت دینے میں کیا مضائقہ ہے، غالباً خصوصیت سے انہیں اس لئے دعوت دی ہوگی کہ وہ آج کل مولانا پر بہت کچھ لکھتے رہتے ہیں، خیر وہ نہ سہی کوئی اور صاحب ہی اس پر روشنی ڈالیں اور ثبوت سے فیروز بخت احمد صاحب کے بیجا دعوے کی تردید فرمائیں!

مطبوعات جدیدہ

نادر مکتوبات حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (اردو ترجمہ) جلد اول و دوم، تحقیق و ترجمہ از جناب مولانا مفتی نسیم احمد فریدیؒ، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش اور پلاسٹک کور، صفحات جلد اول ۴۸۲، جلد دوم ۸۳۳، مجموعی قیمت ۵۰۰ روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی اور حضرت شاہ ولی اللہ اکیڈمی، پھلت (نزد کھتولی) ضلع مظفر نگر، یوپی۔

حجۃ اللہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے علوم و معارف اور ان کے افکار و نظریات کا اصل خزانہ ان کی تصنیفات ہیں، لیکن ان کی فیض مجسم ہستی نے جس فیاضی سے علم و معرفت کی دولت کو عام کیا تھا اس کا ایک مظہر زیر نظر مجموعۂ مکتوبات ہے۔ اہل تعلق و منتسبین کے نام خطوط کی شکل میں دین و شریعت اور اخلاق و حکمت کے اسرار و رموز کو اس شان سے آشکارا کیا گیا ہے کہ گویا ان میں کل تصنیفات کا عطر آ گیا ہے۔ طالبین و سالکین کے علاوہ ان میں عام مسترشدین اور محققین و مورخین کے لئے بھی نہایت قیمتی سرمایہ موجود ہے۔ قریب نصف صدی قبل ان نادر مکتوبات کی دریافت کی سعادت اس مجموعہ کے صاحب دل اور فاضل مرتب کو مولانا سید مرتضیٰ حسنؒ چاند پوری کے کتب خانہ میں حاصل ہوئی تھی اور اس کے پچیس مکتوبات کو فاضل گرامی پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم نے "شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات" کے نام سے مرتب کر کے شایع کر دیا تھا، باقی مکتوبات جن کی تعداد تین سو سے زیادہ ہے ان کے مطالعہ و تصحیح اور ترجمہ و تعلیق کے غیر معمولی کام کو مولانا فریدیؒ نے صد درجہ جاں کاہی، عرق ریزی حتیٰ کہ بینائی

سے محرومی کے باوجود جس خوبی و بلند پایگی سے انجام دیا زیر نظر مجموعہ اس کا بہترین نمونہ ہے، مکتوب الیہم متعدد ہیں، لیکن زیادہ تر خطوط شاہ محمد عاشق پھلتی اور خواجہ نور اللہ بڈھانوی کے نام ہیں۔ جن میں احکام شرعیہ کی ترغیب، مقامات راہ سلوک، وساوس و شبہات کے جوابات، مکشوفات، مقاماتِ تجرید و تفرد و حیرت، بشارت و تعزیت، خوف و رجا، جزا و سزا اور مسائلِ تصوف کا ایک بحر بے پایاں موجزن ہے، مکتوب الیہم کے مذاق، استعداد اور ہمت و صلاحیت اور فرق مراتب کی رعایت سے شاہ صاحب کی حکمت و بصیرت کے مقام بلند کا مشاہدہ بھی ظاہر و باہر ہے۔ مسائل تصوف کے دقیق مقامات کے بیان کے فہم و ادراک و قدر کے اصل مستحق تو اہل حضرات ہی ہیں اور ملاء اعلیٰ، الہام، عطائے خلعت مجددیت کے ایسے مقامات بھی ہیں جن کے کنہ و حقیقت کو شاہ صاحب کے مذاق اور طرز ادا اسلوب سے واقف ہوئے بغیر سمجھنا دشوار ہے، لیکن عقائد و اخلاق کے باب کی بڑی پُر حکمت باتوں کو عام لوگ بھی سمجھ سکتے ہیں۔ مثلاً "بہادر شخص کو میدانِ جنگ میں اور مومن کو صبر و شکر کے موقع پر پہچانا جاتا ہے اور یہ صبر و شکر، ہجوم مصیبت کے وقت مومن کی خاص صفت ہے"۔ "اولاد آدم کے حالات رحمٰن تعالیٰ کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں، پہلی جلال کی انگلی دوسری جمال کی، ضروری طور پر ان دونوں کے تقاضے ظاہر ہونے چاہئیں"۔ "جہاں کہیں بھی رہیں کتب علمیہ کے مطالعہ اور ذکر قلبی کے اشغال سے غافل نہ ہوں"۔ "مرد وہ ہے کہ اس کو جو کچھ پیش آئے اس کو عقل و ادراک کی ترازو میں تولے، قیل و قال پر قانع اور ہر چیز میں مقلد محض نہ ہو"۔ ایک جگہ لکھا کہ "مذاہب اربعہ (حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ، حنبلیہ) سے مطلقاً خروج و اعراض پسندیدہ بات نہیں ہے"۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "غرض یہ ہے کہ سلف صالحین کے طریقے پر تصحیح عقائد کرنا عمل کو سنت سنیہ کے موافق کرنا، ہر حال میں اتباع شریعت کرنا، بدعات سے اجتناب کرنا، خلوت کے اوقات میں لجاجت اور نیاز مندی کے ساتھ مبدع فیاض کی جانب متوجہ ہونا اور کلمہ طیبہ کو

بار بار پڑھنا ان بزرگوں کا اصل طریقہ ہے"۔ پہلے خط ہی میں شاہ صاحب کے مسلک کی روح موجود ہے کہ "عوام الناس کے لئے اس سے بہتر کوئی امر نہیں کہ علوم تقلیدیہ اجمالیہ پر جن کو شارع علیہ السلام نے بیان فرمایا ہے اکتفا کریں، متکلمین کی تحقیقات و تشویشات سے قطع نظر کرلیں اور اس سے زیادہ کوئی غور و فکر نہ کریں نہ نفی میں نہ اثبات میں"۔ ارشاد و تربیت میں یہ زریں قول ہے کہ "ہونا یہ چاہئے کہ آپ کے دل کی زبان آپ کے قلم کی زبان سے زیادہ فصیح و بلیغ ہو"۔ یہ مجموعہ اسی قول کا آئینہ ہے۔ اس کی افادی خوبی اصل عربی و فارسی خطوط کا سلیس ترجمہ ہے۔ پیش لفظ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے قلم سے ہے، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کا مبسوط مقدمہ ہے جس میں شاہ صاحب اور ان کے خاندان، اولاد و احفاد اور تصنیفات کے علاوہ ان کے افکار خصوصاً ان مکتوبات کا تحلیلی مطالعہ شامل ہے، یہ بجائے خود ایک مستقل تصنیف ہے، ڈاکٹر صاحب نے فاضل مترجم و محشی مولانا فریدی کے حالات بھی سپرد قلم کئے ہیں، آخر میں مکتوب الیہم کے مختصر حالات بھی ہیں، اس طرح یہ مجموعہ نور علی نور کا مصداق ہو گیا ہے اور حسن باطن کی طرح حسن ظاہر سے بھی آراستہ ہے۔

مسلکِ اربابِ حق از حضرت مولانا شاہ وجیہ الدین احمد خاں، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۱۴، قیمت ۱۵۰ روپے۔ پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی نمبر ۶۔

مصنف کی حیثیت علمائے رام پور کے گل سرسبد کی سی ہے، مدۃ العمر وہ درس و تدریس اور اصلاح و ہدایت میں مشغول رہے۔ فقہی و مسلکی اختلافات میں ان کا رویہ اعتدال کا رہا۔ فرقہ بندی اور گروہی تعصبات سے وہ نالاں اور ان کے ازالے کے لئے کوشاں رہے، زیر نظر کتاب میں انہوں نے انسانی و اسلامی اصول و احکام کی افادیت بیان کرنے کے علاوہ توحید و شرک، ایمان و کفر و بدعت، ملائکہ، کتب سماویہ اور وحی کے متعلق آسان انداز میں اصل عقائد کی تشریح کردی ہے شفاعت،

تقدیر، میلاد، عرس، فاتحہ، نذر اور سماع موتی جیسے مسائل پر بھی خاصی توجہ کی گئی ہے انبیائے کرامؑ، صحابۂ عظامؓ اور اولیاء اللہؒ کے متعلق عقائد کا بیان بھی ہے، جنات، ہمزاد، بلیات خبیثہ، افلاک، کوکب اور قبر و قیامت کے متعلق رائج عمومی تصورات کی تصحیح کی گئی ہے اور علمائے دیوبند و بریلی کی تحسین کے ساتھ ان کے بعض رویوں پر نکیر بھی ہے، اہل حدیث اور جماعت اسلامی کے باب میں کچھ تندی کا احساس ہوتا ہے۔ حاشیہ نگار نے بھی اس میں اضافہ کیا ہے، مثلاً کتاب التوحید کے متعلق لکھا ہے کہ یہ خاصان خدا کی عظمت کا خاتمہ کر دینے اور بدعقیدہ کر دینے والی کتاب ہے ... بدعقیدگی وہابیوں کا عام شیوہ ہے۔ غنیۃ الطالبین کو حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کی تصنیف قرار دینے کے متعلق بعض جلیل القدر علماء کو اشکال رہا ہے لیکن لائق محشی نے ثابت کیا کہ یہ حضرت جیلانیؒ کی تصنیف نہیں ہے۔ کتاب کا عام لب و لہجہ صلح و اتحاد اور خیر خواہی کا ہے، افتراق بین المسلمین کے اثرات بد سے محفوظ رہنے کے لئے اس سے فائدہ ہو سکتا ہے، شروع میں کتاب اور صاحب کتاب کے تعارف میں مولانا ریاض الدین احمد خاں قادری، پروفیسر نثار احمد فاروقی اور مرتب و محشی جناب وجاہت اللہ خاں قادری کی تحریریں بجائے خود بڑی جامع اور مفید ہیں۔

ابھرتے نقوش از جناب پروفیسر محمد شمیم جیراج پوری، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۰۰، قیمت درج نہیں، پتہ: لائبریری، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، برندابن کالونی، ٹولی چوکی حیدرآباد ۸۔۵۰۰۰۰

جامعہ عثمانیہ اور جامعہ ملیہ میں اردو ذریعہ تعلیم کے خاتمے کی تکلیف دہ یادوں کے ساتھ اردو والے اس خیال سے غافل نہیں رہے کہ ان قابل فخر جامعات کے امتیاز خاص کا احیاء ہو، برسوں کی تگ و دو کے بعد مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے قیام کی تجویز اور پھر سرزمین دکن میں اس کے عملی قیام کی راہ ہموار ہوئی، اردو کے اور سرکاری اداروں کے تجربوں کی روشنی میں

اس سے بہت خوش آیند توقعات قائم کرنے میں پس و پیش بھی تھا لیکن خوش قسمتی سے اس یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر کے لئے جس شخصیت کے نام قرعۂ فال نکلا وہ حقیقتاً فال نیک ثابت ہوا اور صرف دو تین سال کے عرصے میں انہوں نے جس خوبی اور حکمت و ہمت سے معاملات کے ہفت خواں طے کئے اس کے نتیجے میں اب اس جامعہ کے وجود اور دائرہ عمل کے استحکام و وسعت کا مشاہدہ عام ہے، وائس چانسلر ہونے سے قبل پروفیسر محمد شمیم جیراج پوری کی شہرت ایک ممتاز سائنسداں کی تھی، ملکی اور بین الاقوامی سطح پر اسی حیثیت سے ان کا اعتراف کیا گیا، تدریس و تحقیق میں اصلاً سائنس ہی ان کا میدان عمل ہے لیکن وسیع مطالعہ و تجربہ اور خاندانی ماحول کی برکت، اردو یونیورسٹی کی ذمہ داریوں میں ان کے کام آئی، ان کے والد ڈاکٹر محمد معظم خوش کلام شاعر تھے اور ان کے دادا مولانا محمد اسلم جیراج پوری محتاج تعارف نہیں اس علمی و ادبی میراث کا مظہر زیر نظر کتاب ہے، گویہ مولانا آزاد یونیورسٹی کے قیام کی ابتدا اور اس کی ایک سال کے سفر کی روداد ہے لیکن شگفتہ اسلوب اور منجھی ہوئی نثر نے اس کو دلکش بنا دیا ہے اس سفر کا ہر نقش دل آویز اور آیندہ سنگ میل ثابت ہونے کا اہل ہے، حیدرآباد اور دوسرے شہروں میں یونیورسٹی کے سلسلے میں سمیناروں اور مباحثوں کی روداد میں کام کی چیزیں آگئی ہیں، تعلیم و تدریس کے عملی مسائل سے واقف اور عہدہ برآ ہونے کے لئے ان میں خاصا سامان بصیرت و افادیت ہے، خوشی کی بات یہ بھی ہے پروفیسر جیراج پوری کے قلم کی اسلامیت ان کی سلامت طبع کے اظہار میں نمایاں ہے، مثلاً گلبرگہ کی ایک مجلس میں انہوں نے کہا کہ "قرآن سائنس کا مخزن ہے ... میں نے قرآن کو سمجھ کر پڑھا تو مجھے قرآن سے بہتر سائنس میں اور کوئی کتاب نہیں لگی" ایک اور موقع پر یہ کہا کہ "مذہب کو سائنس سے الگ نہیں کیا جا سکتا ہے کیونکہ اسلام میں چودہ سو سال قبل ہی تمام سائنسی ایجادات کے اشارے قرآن مجید میں فراہم کر دیئے گئے تھے، اردو کے

متعلق ان کے خیالات پُرعزم اور رجائی ہیں، اردو ذریعہ تعلیم سے مایوس نہ ہونے کی تلقین کرتے ہوئے وہ اپنی زبان پر اعتبار و اعتماد کا اظہار کرتے ہیں، مولانا آزاد یونیورسٹی کے یہ ابھرتے نقوش دراصل ایسے تارے ہیں جن کی روشنی میں اردو والوں کے لئے کئی اور راہیں منور ہوسکتی ہیں۔

سخنہائے گفتنی از جناب پروفیسر اکبر رحمانی، متوسط تقطیع، کاغذ و طباعت مناسب، صفحات ۱۲۰، قیمت ۶۰ روپے، پتہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ممبئی، علی گڑھ۔

تعلیم و تدریس اور اردو زبان اس کتاب کے فاضل مولف کا خاص موضوع ہے وہ ایک عرصے تعلیمی و تدریسی مسائل پر نہایت اخلاص و دردمندی سے غور و فکر کرتے رہے اور اس کے لئے سرگرم عمل ہیں، مہاراشٹر کے ایک گمنام علاقے سے انھوں نے اسی مقصد کے لئے رسالہ آموزگار جاری کیا جس کی اہمیت و افادیت نے اس کی شہرت دور دور تک عام کی، "سخنہائے گفتنی" اسی رسالے کے اداریے کا عنوان ہے جس کے تحت تعلیمی مسائل کے علاوہ مختلف اور قومی و ملی معاملات پر ان کی تحریریں شایع ہوکر مقبول ہوتی رہیں، اب ان کو کتابی شکل میں یکجا کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور زیر انتخاب اس کا پہلا حصہ ہے اس میں اردو خصوصاً مہاراشٹر میں اس کی تعلیم و تدریس کے مختلف مسائل کا ذکر ہے، حکومت کی تعلیمی پالیسیوں، نصاب میں تباہ کن تبدیلیوں، پرائمری تعلیم کی تشویشناک صورت حال، دینی مدارس کے نصاب اور طلبہ کی بے راہ روی کے علاوہ اردو والوں کی معیار بندی کا جیسے موضوعات پر یہ تحریریں خاص طور پر دعوت غور و فکر دیتی ہیں، ایک اداریہ عصمت چغتائی کے متعلق ہے اور یہ جرأت و غیرت کا نمونہ ہے، مقدمہ صاحب معارف مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے قلم سے ہے، ان کی یہ رائے بجائے خود ایک سند ہے کہ "مفید خیالات اور معلومات پر مشتمل ہونے کی وجہ سے کتاب بڑی قدر و قیمت کی حامل اور تعلیم و تدریس سے وابستہ حضرات کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔" یہ کہنا بھی بجا ہے کہ سلیس و شگفتہ تحریر نے اس کی عظمت میں اضافہ کیا ہے۔

ع۔ص۔

تصانیف مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم

صحابہؓ: (حصہ اول) اس میں صحابہ کرامؓ کے عقائد، عبادات، اخلاق و معاشرت کی تصویر پیش کی ... — قیمت ۵۰/روپے

سیر صحابہؓ: (حصہ دوم) اس میں صحابہ کرامؓ کے سیاسی، انتظامی اور علمی کارناموں کی تفصیل دی گئی ... — قیمت ۵۶/روپے

سیر صحابیاتؓ: اس میں صحابیات کے مذہبی، اخلاقی اور علمی کارناموں کو یکجا کردیا گیا ہے۔ — قیمت ۲۰/روپے

سیرت عمر بن عبدالعزیز: اس میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کی مفصل سوانح اور ان کے تجدیدی ...وں کا ذکر ہے۔ — قیمت ۳۲/روپے

امام رازی: امام فخرالدین رازی کے حالات زندگی اور ان کے نظریات و خیالات کی مفصل تشریح کی گئی ... — قیمت ۴۵/روپے

حکمائے اسلام: (حصہ اول) اس میں یونانی فلسفہ کے ماخذ، مسلمانوں میں علوم عقلیہ کی اشاعت اور ...ویں صدی تک کے اکابر حکمائے اسلام کے حالات، علمی خدمات اور فلسفیانہ نظریات کی تفصیل ہے۔ — قیمت ۵۰/روپے

حکمائے اسلام: (حصہ دوم) متوسطین و متاخرین حکمائے اسلام کے حالات پر مشتمل ہے۔ — قیمت ۳۰/روپے

شعر الہند: (حصہ اول) قدماء سے دور جدید تک کی اردو شاعری کے تغیر کی تفصیل اور ہر دور کے مشہور ...ذہ کے کلام کا باہم موازنہ۔ — قیمت ۹۲/روپے

شعر الہند: (حصہ دوم) اردو شاعری کے تمام اصناف غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ وغیرہ پر تاریخی و ادبی ...یت سے تنقید کی گئی ہے۔ — قیمت ۷۰/روپے

اقبال کامل: ڈاکٹر اقبال کی مفصل سوانح اور ان کے فلسفیانہ و شاعرانہ کارناموں کی تفصیل کی گئی ہے۔ — قیمت ۸۰/روپے

تاریخ فقہ اسلامی: تاریخ التشریع الاسلامی کا ترجمہ جس میں فقہ اسلامی کے ہر دور کی خصوصیات ذکر ...ئی ہیں۔ — قیمت ۱۲۵/روپے

انقلاب الامم: سر تطور الامم کا انشاء پردازانہ ترجمہ۔ — قیمت ۵۵/روپے

مقالات عبدالسلام: مولانا مرحوم کے اہم ادبی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ۔ — قیمت ۴۰/روپے